زندگی اور موت

از

ملک الشعراء ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

مترجمہ

حسرت بی۔اے

پبلشرز

کتابستان اردو اندرون لوہاری گیٹ لاہور

بار سوم

شاعر کی شکست

شہزادی کا نام اجیتا تھا۔ امر پور کے راجہ نرائن کے دربار کا شاعر کبھی اُس سے رُوبرو نہ ہُوا تھا۔ جس دن شاعر راجہ کے سامنے کوئی نئی نظم پڑھتا وہ اپنی آواز اتنی بلند کر لیتا۔ کہ اُس کے نغموں کی رسائی بالاخانے کی چلمنوں کے پیچھے نادیدہ سامعین کے کانوں تک ہو سکے۔ وہ اپنے نغمے کو اپنی رسائی سے دُور اُس تاروں بھری دُنیا میں پہنچا دیتا۔ جہاں ادراک اور نظر کی سرحد سے پرے وہ ستارہ جو اُس کے مقدر کا رہنما تھا۔ ایک ہالۂ نور میں گھرا ہُوا چمک رہا تھا۔

کبھی کبھی پردوں کے پیچھے اُسے کوئی خیالی صورت حرکت کرتی ہوئی نظر آتی۔ اور کبھی دور سے چھم چھم کی صدا اُس کے کانوں میں پہنچتی اور وہ ان خوبصورت ٹخنوں کے خواب دیکھنے لگتا۔ جن کی خلخال کے ننھے ننھے طلائی گھنگرو ہر قدم پر راگ پیدا کرتے تھے۔ ہائے وہ سُرخ و سفید نازک پاؤں جو اس خاکی زمیں پر اُسی طرح پڑتے تھے جس طرح گنہگاروں پر خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ یہ پاؤں شاعر نے اپنے دل کے مندر میں بسا رکھے تھے۔ جہاں وہ اپنے راگ کے سُروں کو

اُن کے طلائی گھنگھروؤں کی صدا سے ہم آہنگ کر دیتا۔ اُس کے دل میں کبھی اس بات کے متعلق ذرا سا شبہ بھی پیدا نہ ہُوا کہ ارٹ کے پیچھے کس کا پرتو نظر آتا ہے۔ اور وہ کس کے پاؤں کے گھنگرو ہیں، جن کی موسیقی سے اُس کے دل کے ساز کے تار نغمہ مستعار لیتے ہیں۔

شہزادی کی خادمہ منجری دریا پر جاتے ہوئے ہر روز شاعر کے گھر کے پاس سے گزرتی۔ اور اُس سے ایک آدھ بات کر لینے کا موقع کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ جب سڑک ویران ہو جاتی۔ اور تاریکی زمین پر چھائونی چھا لیتی، وہ بلا تامل اُسکے کمرہ میں داخل ہوتی اور قالین کے ایک گوشہ پر بیٹھ جاتی اُس کے نقاب کا رنگ اور اُس کے بالوں میں گندھے ہوئے پھول دیکھ کر یوں معلوم ہوتا۔ کہ وہ اپنی آرائش میں غیر معمولی اہتمام کرتی ہے۔

لوگ یہ دیکھ کر مسکراتے اور سرگوشیاں کرتے تھے۔ اور وہ حق بجانب تھے۔ کیونکہ شاعر نے کبھی اس بات پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کی تھی۔ کہ یہ ملاقاتیں اُس کے لئے دلی مسرت کا باعث ہوتی ہیں۔ لڑکی کے نام کے معنی "شاخِ گل" تھے۔ ایک عام آدمی کے لئے یہی نام کافی دلکش ہو سکتا ہے۔ لیکن شاعر نے اپنی طرف سے اس نام میں اضافہ کیا وہ اُسے "شاخِ گل ہائے بہار" کہتا تھا۔ عام لوگ

تاسّف سے سر ہلاتے اور کہتے "ہائے افسوس"۔

بہار کے متعلق شاعر جو اشعار لکھتا۔ اُن میں "شاخِ گل ہائے بہار" کی تعریف نمایاں طور پر نظر آتی۔ اس پر راجہ شاعر کی طرف آنکھوں سے اشارے کرتا۔ اور مسکراتا۔ اور شاعر بھی جواب میں مسکرا دیتا۔

پھر بادشاہ اُس سے پوچھتا۔ کیا شہد کی مکھی کا کام صرف یہی ہے۔ کہ بہار کے دربار میں بھنبھناتی اور گاتی رہے؟"

شاعر جواب دیتا "نہیں بلکہ شاخِ گل ہائے بہار کا شہد چوسنا بھی اُس کا کام ہے"۔

اس پر راجا کے دربار میں سب لوگ ہنستے اور کہتے ہیں شہزادی اجینتا بھی یہ دیکھ کر ہنسا کرتی۔ کہ اُس کی خادمہ نے شاعر کا نام اپنے نام سے وابستہ ہو جانے دیا ہے۔ منجری دل ہی دل میں خوش ہوتی۔

اسی طرح دُنیا میں جھوٹ اور سچ کی آمیزش ہوتی رہتی ہے۔ اور جو کچھ خدا بناتا ہے۔ انسان آرائش کے لئے اس میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیتا ہے۔

خالص صداقت صرف اُن نغموں میں تھی۔ جو شاعر کی زبان پر رواں ہوتے اُن کے نغموں کا موضوع کیا تھا۔ وہ درد جس کا آغاز ازل سے ہُوا۔ اور وہ مسرت جو تا بہ ابد برقرار رہے گی۔ اور کرشن جینت

کا دیوتا اور رادھا اُس کی محبوبہ — ازلی و ابدی مرد اور عورت! یہی اُس کے نغموں کا موضوع تھے۔ شاہ سے لیکر گدا تک کا دل ان نغموں کی صداقت کا معترف تھا۔ شاعر کے نغمے ہر شخص کی زبان پر جاری تھے۔ بادِ برشگال کی ہلکی سی سنسناہٹ — چاند کی کرنوں کی ذراسی جھلک فضا کو اُس کے گائے ہوئے نغموں سے معمور کر دیتی۔ اور مکانوں کی کھڑکیوں میں، کھُلے میدانوں میں، کشتیوں میں، عام گذر گاہوں میں، ہزاروں زبانوں پر اس کے نغمے رواں ہو جاتے۔

اسی طرح ہنسی خوشی زمانہ گذرتا رہا۔ شاعر شعر سُناتا، راجہ سنتا، لوگ تعریف کرتے، پنہجری دریا کو جاتے ہوئے شاعر کے کمرے کے پاس سے گذرتی۔ بالاخانے کی چلمنوں میں سے کسی کا سایہ متحرک نظر آتا۔ اور دور سے ننھے ننھے گھنگروؤں کی صدا سُنائی دیتی۔

انہیں دنوں جنوب کی طرف سے ایک اور شاعر اپنے کمال کے نشہ میں سرشار "شاعری کی دُنیا کا بادشاہ صرف میں ہوں" کہتا ہوا دُنیائے شعر کی تسخیر کو روانہ ہوا۔ وہ امرپور کی راجدھانی میں راجہ نرائن کے دربار میں بھی حاضر ہوا اور تخت کے سامنے باادب ایستادہ ہو کر اُس نے راجہ کی مدح میں ایک شعر پڑھا۔ راستے میں وہ تمام درباروں کے شعراء کو مقابلہ کی دعوت دے چکا تھا۔ اور اس

مہم میں ہر جگہ منصور و فتحمند ہوتا رہا تھا۔

راجہ نے اعزاز و اکرام کے ساتھ اُس کا خیر مقدم کیا۔ اور کہا۔ "شاعر خوش آمدید"

ہنڈارک (شاعر) نے ایک پُر غرور انداز میں جواب دیا "مہاراج میں مقابلہ چاہتا ہوں"

راجہ کے دربار کے شاعر شنبکھر کو معلوم نہ تھا۔ کہ شعر کا مقابلہ کس طرح ہوگا۔ وہ رات بھر نہ سو سکا۔ شہرۂ آفاق ہنڈارک کا بھاری بھر کم ڈیل ڈول اُس کی نوکیلی کٹار کی سی ناک اور اُس کا عجیب طرح کا سر جس کو دیکھ کر ہنسی آئے ـــــ شانے کی طرف جھکا ہوا تمام شب اُس کی آنکھوں میں پھرتا رہا۔

صبح شنبکھر کانپتے ہوئے دل کے ساتھ دربار میں داخل ہوا۔ لوگ کثرت سے جمع تھے۔ شاعر نے سر جھکا کر مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ حریف کا خیر مقدم کیا۔ ہنڈارک نے بھی جواب میں سر کو ایک ہلکی سی جنبش دی۔ پھر اپنے مداحوں اور حاشیہ نشینوں کے حلقہ کی طرف ایک معنی خیز نگاہ ڈالی۔

شنبکھر نے بالا خانے کی چلمنوں پر نظر ڈالی۔ اور پھر سر جھکا کر دل ہی دل میں کہا "میری ملکہ اگر آج کا معرکہ میرے ہاتھ رہا۔ تو

تیرا عزت والا نام سورج کی طرح چمکے گا۔"

نوبت بجنے لگی۔ اور ہجوم "مہاراج کی جے" پکارتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ راجہ سفید شاہانہ لباس پہنے خراماں خراماں کمرہ میں داخل ہوا اور تخت پر بیٹھ گیا۔

پنڈارک کھڑا ہوا۔ اور اس وسیع کمرہ میں بالکل خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ سر کو اوپر اٹھا کر چھاتی پھیلائے اپنی گرجتی اور گونجتی ہوئی آواز کے ساتھ راجہ نرائن کی شان میں تعریفی اشعار پڑھ رہا تھا۔ اس کے الفاظ سمندر کی موجوں کی طرح محل کی دیواروں کیساتھ ٹکراتے تھے۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ سننے والوں کی پسلیوں سے ٹکرا ٹکرا کر ان میں کھڑکھڑاہٹ پیدا کر رہے ہیں۔ جس ہنرمندی کے ساتھ اس نے نرائن کے نام کو مختلف معانی کا جامہ پہنایا۔ اور اس کے حرف حرف کو متعدد مجموعوں کے اندر اپنے شعروں کے جال میں بُنا اس کو دیکھ کر سامعین دنگ اور دم بخود رہ گئے۔

پنڈارک کے بیٹھ جانے کے بعد ایک عرصہ تک اس کی آواز محل کے بیشمار ستونوں کے درمیان لہراتی اور گونجتی رہی۔ اور ہزاروں خاموش دلوں پر ایک خاص کیفیت طاری رہی۔ ودیاوان پنڈت جو دُور دُور کے دیسوں سے چل کر آئے تھے۔ اپنے دہنے ہاتھ اُٹھا کر چلائے۔

"دھن ہو!!!"

راجہ نے شنکھر کے چہرہ پر ایک نظر ڈالی۔ شاعر نے جواب میں اپنی حسرت بھری آنکھیں ایک لمحہ کے لیے اپنے آقا کی طرف اٹھائیں اور اس کے بعد ایک چوکڑی بھولے ہرن کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ اور اس پر عورتوں کی سی شرم طاری تھی۔ اس کا نوخیز اور نازک چھریرا بدن کسی طنبور کے کھینچے ہوئے تار سے مشابہ نظر آتا تھا۔ جو ایک خفیف سے مس پر بھی بلند آہنگ نغمے پیدا کرنے پہ آمادہ ہو۔

ابتدا میں اس کی آواز دھیمی تھی۔ اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اس نے اپنا سر بلند کیا۔ اور اس کی صاف اور شیریں آواز ایک لرزتے ہوئے شعلہ کی طرح آسمان کی طرف اٹھنے لگی۔ اس نے شاہی خاندان کے شاندار کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے زمانہ کی قدامت کی دھندلی فضاؤں کو چیر کر ان درخشاں روایات کا سلسلہ خاندان کے مورث اعلیٰ تک پہنچا دیا۔ اور پھر پشت بہ پشت بے مثل شجاعت اور بے نظیر سخاوت کے قصے بیان کر کے اس نے ان کارناموں کا سلسلہ موجودہ عہد سے ملایا۔ اس نے راجہ پر اپنی نظریں جما دیں۔ اور شاہی خاندان کی جو محبت لوگوں

کے دلوں میں پوشیدہ تھی۔ اُس کے نغموں کے جادو سے خوشبو کی طرح پھیل کر تخت کے گرد ہالہ باندھنے لگی۔ جب وہ کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھا۔ اُس کی زبان پر یہ الفاظ تھے "آقا میں لفظی ہیر پھیر اور حروف کے گھوم گھماؤ میں ہار سکتا ہوں۔ لیکن تیری محبت میں شکست نہیں کھا سکتا"

سُننے والوں کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ اور پتھر کی دیواریں جے جے کے نعروں سے گونجنے لگیں۔

سر کی ایک پُرشکوہ جنبش اور حقارت آمیز تبسم کے ساتھ عام جذبات کے اس جوش کا مذاق بتاتے ہوئے پنڈارک نے کھڑے ہو کر بھری مجلس کے سامنے یہ سوال پیش کیا۔

دنیا میں الفاظ سے بدتر اور کیا چیز ہے؟" یکایک دربار پر پھر وہی خاموشی طاری ہو گئی۔

اس کے بعد علم و فضل کی ایک معجزانہ نمائش کے بعد اُس نے ثابت کیا۔ کہ "لفظ" ہر چیز سے مقدم ہے۔ "لفظ" خدا ہے۔ اُس نے مقدس کتابوں کے اقتباسات کا ایک انبار لگا دیا۔ اور اس طرح ایک بہت بڑا خیالی مندر تعمیر کیا۔ جس میں "لفظ" کا سنگھاسن زمین و آسمان کی ہر چیز سے بلند بنایا گیا۔ پھر اُس نے اپنی گرجتی ہوئی آواز

کے ساتھ وہی سوال دُہرایا " ہاں دُنیا میں الفاظ سے برتر کیا چیز ہے ؟ "

اُس نے اپنے اِردگرد ایک پُرغرور نگاہ دوڑائی۔ کسی شخص کو اُس کا مدِ مقابل بننے کی ہمت نہ ہوسکی۔ آخر وہ اُس شیر کی طرح جو اپنے شکار سے خوب سیر ہو کر پیٹ بھر چکا ہو۔ آہستگی کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ پنڈتوں نے دھن دھن! کی آواز بلند کی۔ راجہ حیرت سے خاموش تھا۔ اور شیکھر (شاعر) اس باکمال شخص اور اس کی حیرت انگیز قابلیت کے سامنے اپنے آپ کو بالکل بے حقیقت محسوس کر رہا تھا۔ آخر دربار اس دن کے لئے برخاست ہوا۔

دوسرے دن شیکھر نے اپنا ترانہ گاکر ابتدا کی۔ اُس نے نغموں میں اُس دن کا بیان تھا۔ جب پریم کی بانسری کے سُریلے سُہانے سُر پہلے پہل بندرابن کی چُپ چاپ ہواؤں میں لہراتے تھے۔ اور گوپیاں اور اہیرنیاں حیران ہوتی رہی تھیں۔ کہ یہ کون گاتا ہے۔ اور مدبھرے من موہنے راگ کانوں میں کہاں سے آرہے ہیں۔ کبھی وہ سمجھتیں۔ کہ دکھن سے پون کی لہریں راگ کو بہائے لئے آرہی ہیں۔ اور کبھی سوچتیں۔ کہ پربت کی چوٹیوں پر متوالے بادل ہی جھوم جھام کر گا رہے ہیں۔ یہ پریم رس کی الوپ لہریں تھیں۔ جو پورب میں سورج

دیوتا کے ہردے سے اُٹھتیں۔ اور بلاپ کے منوہر سندیسے سُناتی ہوئیں کسی برہ کے مارے ہوئے کی دُکھ بھری آہیں بنکر چھم چھم میں جا گرتیں۔

تارے یوں دکھائی دیتے۔ جیسے اُسی سارنگی کے کان ہیں۔ جس نے نیند کے ماتوں کے سپنوں کو بھی راگ سے بھر دیا تھا۔ چاروں کھونٹ راگ ہی راگ سُنائی دیتا تھا۔ کھیتوں اور پھلواڑیوں میں اندھیری گلیوں اور اُجاڑ سڑکوں میں آکاش کی پگھلتی ہوئی نیلاہٹ اور گھاس کی لہلہاتی ہوئی ہریاؤلی میں راگ ہی راگ تھا۔ وہ سب اچنبھے میں تھیں۔ کہ یہ کیا بھید ہے۔ اُس دن اُنکے من میں جو چاؤ اُٹھ رہے تھے اُن کا اس سنسار کی کسی بولی میں سمجھانا اُن کے لئے کٹھن تھا۔ اُن کے نینوں میں آنسو بھر بھر آئے۔ اور اُن کے من جینے سے اُچاٹ ہو گئے۔ اُنکو مر کر مٹ جانے کی چاہ ہو گئی۔ کہ سو برس جینے کے بعد بھی انت مرنا ہے۔

شیکھر دنیا اور دُنیا کی ہر چیز سے بے خبر ہو رہا تھا۔ راجہ اور اُس کا دربار اور ینڈار ک اور اُس سے مقابلہ کچھ بھی اُسے یاد نہ رہا تھا۔ وہ اپنے خیالات کے درمیان تنہا کھڑا تھا۔ جو اُن پتوں کی طرح جنہیں بادِ بہار میں جھونکے آ رہے ہوں۔ اسکے گِرد لرزتے اور سرسراتے تھے۔ اور اسکی زبان پر بانسری راگ جاری تھا اُس وقت اُس کے دماغ میں ایسی مورت کا تصوّر تھا۔ جو ایک پر تو سے صورت

پذیر ہوتی تھی۔ اور کسی خلخال کے گھونگھروؤں کی دھیمی دھیمی جھنجھناہٹ کہیں دور سے اُس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

آخر وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس وقت سامعین کے جسم کا رُواں رُواں ایک نا قابلِ فہم سرور کی درد انگیز کیفیت سے لرز رہا تھا۔ یہ کیفیت جتنی پُر اسرار تھی۔ اُتنی ہی عمیق بھی تھی۔ خود فراموشی کے عالم میں لوگ شاعر کو داد دینا بھی بھول گئے۔ جب جذبات کا مدّ وجزر ذرا دھیما ہوا۔ بنڈارک نے مقابلے کے جوش میں کھڑے ہو کر حریف کو دعوت دی۔ کہ سامنے آ کر اس عاشق کی تعریف بیان کرے اور بتائے کہ اس کی محبوبہ کون تھی۔ اُس نے اپنے گرد ایک پُر غرور نگاہ ڈالی اور اپنے حاشیہ نشینوں کی طرف دیکھ کر مُسکرایا پھر دوبارہ اُس نے سوال کیا۔ ”ہاں بتاؤ کرشن عاشق اور رادھا معشوقہ کون ہیں؟“ اس کے بعد خود اُس نے ان لفظوں کا مادہ بتانا شروع کیا۔ اور شرح و بسط کے ساتھ اُنکے متعدد مفہوم بیان کئے۔ اُس نے اپنے بوکھلائے ہوئے سامعین کے سامنے ایک سِٹی گم کر دینے والی ہنر مندی کے ساتھ الہیات کے مختلف پیچ در پیچ مسائل بیان کئے پھر وہ ان ناموں کے ایک ایک حرف کو اُن کے ساتھ کے حروف سے الگ کرتا اور اپنی بے پناہ منطق کے ساتھ تجزیہ کرتے کرتے ان کی خاک اُڑا دیتا۔ جس سے دوبارہ وہ اس لفظ کو پیدا کر کے اُسے ایک ایسے نئے مفہوم کا جامہ پہناتا۔ جو اس سے قبل کسی

بڑے سے بڑے ماہر علم اللسان کے تصور میں نہ آیا تھا۔

پنڈتوں کے دلوں میں ایک ہیجان بپا تھا۔ وہ بے اختیار تحسین و آفرین کی پُر جوش آوازیں بلند کر رہے تھے۔ اور باقی لوگ بھی اس مغالطہ میں گرفتار ہو کر کہ آج انہوں نے اپنی آنکھوں سے علم کی حیرت انگیز قوت کے ساتھ مسلمات کی قبا کی آخری دھجیاں بکھرتی دیکھ لیں ہیں۔ پنڈتوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ علم کے اس حیرت انگیز مظاہرہ کو دیکھ کر وہ اپنے ہوش و حواس کھو کر وہ یہ سوچنا بھی بھول گئے۔ کہ آخر ان باتوں میں حقیقت کا کوئی شائبہ ہے یا نہیں۔

راجہ حیرت و استعجاب میں گم تھا۔ فضا میں موسیقی کا گمان بھی باقی نہ رہا تھا۔ سبزہ کے فرش کی جگہ پتھروں کی سڑک نے لے لی تھی۔ شعریت کو حقیقت کے کھردرے پن نے کچل ڈالا تھا۔

لوگوں کو اقلیم ادب کے اس بے پروا اخرام ڈیوک کے سامنے جو ہر قدم پر مشکلات کو بے روک ٹوک روندتا چلا جاتا تھا۔ اپنا شاعر کل کا بچہ معلوم ہونے لگا۔ اُس وقت ان پر یہ ظاہر ہوا۔ کہ جو نظمیں شنکھر لکھتا ہے۔ وہ بالکل سیدھی سادھی ہوتی ہیں۔ اور وہ اگر چاہیں تو خود بھی ویسی نظمیں لکھ سکتے ہیں۔ وہ دل میں کہتے۔ اُس کی نظمیں بالکل بیکار ہوتی ہیں۔ نہ اُن میں کوئی دقت ہوتی ہے۔ نہ جدت اور نہ اُن سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔"

راجہ نے کنکھیوں سے اپنے شاعر کی طرف دیکھا۔ اور اُسے ایک آخری کوشش کے لیئے آمادہ کرنا چاہا۔ لیکن شنکھر نے کچھ خیال نہ کیا۔ اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ آخر راجہ ناراض ہو کر تخت سے اُٹھا۔ اور اپنے گلے سے ہیروں کی مالا اُتار کر ینڈارک کو پہنا دیا۔ محل مسّرت کے نعروں سے گونج اُٹھا بالا خانے میں خفیف سی ہلچل پیدا ہوئی۔ اور کپڑوں کی سرسراہٹ اور طلائی گھونگھروؤں کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دی۔

چاند زوال پر تھا۔ اور رات تاریک تھی۔ شاعر نے اپنی نظموں کے مسودے الماری سے نکالے۔ اور زمین پر اُن کا ڈھیر لگا دیا۔ اُنمیں سے بعض اُسکی بہت پرانی نظمیں تھیں۔ جن کو وہ تقریباً بھول چکا تھا۔ چند اوراق کو اُس نے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اب اُسے یہ بالکل بے کار نظر آئے محض الفاظ اور طفلانہ خیالات کے مجموعے۔

اُس نے ان اوراق کو پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیا۔ اور پھر یہ الفاظ کہتے ہوئے انہیں دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا" اے حسن! میں اپنا سب کچھ تجھ پر قربان کرتا ہوں۔ اِس حقیر اور بیکار زندگی میں تیری محبت کی آگ کئی سال تک میرے سینے میں بھڑکتی رہی ہے۔ اگر یہ زندگی سونا ہوتی۔ تو آج میں اس آزمائش سے کندن بن کر نکلتا۔ لیکن آہ یہ زندگی پاؤں تلے روندی ہوئی خشک گھاس سے بھی زیادہ حقیقت

ہے۔ اب مٹھی بھر راکھ کے سوا اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے گا"۔
رات زیادہ تاریک ہوتی گئی۔ شنکھر نے اپنے مکان کی کھڑکیوں کے پٹ کھول دیئے۔ اور اپنے بستر کو گلِ شبّو، گلِ داؤدی اور گلِ یاسمین سے ڈھک دیا۔ یہ اُس کے چاہیتے پھول تھے۔ پھر جس قدر چراغ اُسکے گھر میں موجود تھے۔ وہ سب جمع کر کے اُس نے اپنے سونے کے کمرے میں روشن کر دیئے۔ اُس کے بعد اُس نے شہد میں کسی زہریلی بوٹی کا رس ملایا۔ اور اُس کو پی کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔
دروازے کے باہر سڑک پر طلائی خلخالوں کے گھنگھروؤں کی چھم چھم سنائی دی۔ اور ہوا کے ساتھ کمرے میں ایک بھینی بھینی خوشبو داخل ہوئی۔
شاعر نے آنکھیں کھولے بغیر کہا:۔ "میری ملکہ! آخر تمہیں اپنے غلام پر رحم آ گیا۔ اور تم اُس سے ملنے کے لئے آ گئیں؟"
جواب میں ایک رسیلی آواز سنائی دی "ہاں میرے شاعر میں آ گئی ہوں"۔
شنکھر نے آنکھیں کھول دیں۔ اور اپنے روبرو ایک لڑکی کو کھڑے ہوئے دیکھا۔
شاعر کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ اُسے یوں معلوم ہوا۔ کہ وہ مورت جو ایک پر تو سے صورت پذیر ہو کر اُس سے پہلے اُسکے دل کے مقدس مندر

میں چھپی چھپی رہتی تھی۔ اب اس آخری ساعت میں اُس کو دیکھنے کے لئے باہر آگئی ہے۔

لڑکی نے کہا: "میں شہزادی اجینتا ہوں"

شاعر انتہائی کوشش کے ساتھ اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھا۔

شہزادی نے آہستہ سے اُس کے کان میں کہا "مہاراج نے تم سے انصاف نہیں کیا۔ میرے شاعرانہ مقابلے میں کامیاب تم ہی رہے اور میں تمہارے سر کامرانی کا سہرہ باندھنے کے آئی ہوں"

پھر اُس نے اپنے گلے سے پھولوں کا ہار اُتار کر اُس کے سر پہ رکھ دیا۔ شاعر بستر پہ پیچھے کو گرا۔ اور موت نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

قرض

قید خانے کی شب کے اختتام پر سوشن اپنی آخری عبادت میں مشغول تھا۔ دروازے کھلے۔ اور شاما ہاتھ میں چراغ لئے ہوئے اُسکے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اُس کے اشارے پر اُس کی زنجیر اُتار لی گئی۔ اور اُس نے کہا۔ "تم مجھے رحم کے ستارے کی طرح معلوم ہوتی ہو۔ جو نا امیدی میں جھلک رہا ہے۔"

"رحم کا ستارہ!" عورت نے آہستہ سے کہا۔ اور پھر گرج کے جیسا قہقہہ لگایا۔ جس کے بعد موسلا دھار بارش ہونے لگتی ہے۔ آواز باز گشت، بھوتوں کے گھبرائے ہوئے گروہ کی طرح چاروں طرف پھیل کر خاموشی میں قید خانے کی دیواروں سے ٹکرانے لگی۔

بروناکے کنارے صبح کھجوروں کے دھندلے سلسلے میں جھلکی۔ شاما نے گھاٹ پر کشتی میں قدم رکھ کر کہا۔ "آ میرے پیارے! ہم ماضی کی اسیری سے نکل کر نامعلوم کی طرف بہ جائیں۔"

کشتی دریا میں روانہ ہوئی۔ اور سوشن نے شاما کا سر اپنے سینے پر یہ کہہ کر رکھ لیا۔ "مجھے بتاؤ۔ تم نے مجھے ہمیشہ کی قید میں گرفتار کرنے کے

لئے میری آزادی کو کیونکر خریدا ؟"

عورت نے اپنے سینے کو زور سے دبایا۔ اور کہا۔" ابھی نہیں!"۔

موجوں کے ساتھ بہتی ہوئی کشتی پر دوپہر کے سورج کی روشنی پڑی۔ عورتوں نے گاگریاں بھر لی تھیں۔ اور قطرہ قطرہ پانی ٹپکتے ہوئے کپڑوں کے ساتھ اشنان کر کے گھر واپس ہوگئی تھیں۔ صبح کا بازار ختم ہوگیا تھا۔ اور بانسوں کے درمیان کا تنگ راستہ سونا پڑا تھا۔

پھولی ہوئی سرسوں کے کھیت کی خوشبو سے لدی ہوئی ہوا نے شاما کے چہرے سے نقاب ہٹادی۔ اور سوشن نے اُس کے کان میں کہا۔" مجھے میرے فرض بتاؤ۔ جو ادا نہیں کئے جاسکتے۔ تاکہ میں انہیں اپنے دل خوشگوار ناامیدی کے ساتھ شمار کرتا رہوں۔ شاما نے اپنے چہرے پر پھر نقاب ڈال لی۔ اور کہا۔" ابھی نہیں!"

وہ سوال جو تمام دن جواب کے لئے دردانگیز رہا۔ رات کی خاموشی میں اور زیادہ تکلیف دہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ شاما نے ایک آہ بھری اور آہستہ سے کہا۔" میں نے تمہارے لئے جو کچھ کیا۔ وہ دشوار تھا۔ لیکن اب اُس کا تم سے کہنا اور زیادہ دشوار ہے۔ میں اسے مختصر کروں گی اور تم بھی اُس کے بھلا دینے میں اُتنا ہی مختصر وقت صرف کرو۔ نوجوان انتیا نے میرے لئے اپنی شباب آلود محبت سے وارفتہ ہوکر میرے سامنے میری

زندگی سے اپنی محبت ثابت کرنے کے لئے تمہارے جرم کا الزام اپنے سر لے لیا تھا۔ میرے بہترین عزیز! مَیں نے اپنی زندگی کا بدترین گناہ تمہارے لئے کیا تھا۔

چاند نیچے چلا گیا۔ جنگل اپنے سناٹے کی وجہ سے خوف زدہ ہو رہا تھا۔ عورت کی کمر کے گرد سوشن کا ہاتھ ڈھیلا ہُوا۔ اور علیحدہ ہو گیا۔ ان کے درمیان کی تمام چیزیں فضا اور سکون سب کچھ پتھر کی طرح سخت ہو گئیں۔ یک بیک شاتا زمین پر گر گئی۔ اور اُس کے قدموں سے چمٹ گئی۔ اور ایک ایسی آواز میں بولی۔ جو آنسوؤں کی کمی کی وجہ سے بھرائی ہوئی تھی۔ ”میرا خدا مجھے سزا دے، مگر تم نہ دو۔

سوشن کھڑا ہو گیا۔ اپنے کو اُس کے بازوؤں سے آزاد کیا۔ اور کشتی سے نکل کر اندھیرے سائے میں چلا گیا۔

جنگل کے راستے میں اُس کے قدموں کے نیچے خشک پتیاں کھڑکھڑاہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ جہاں ہوا خوشبو سے بھری ہوئی تھی۔ اور مختلف الہیئت شناخیں حالت ہذیان کے فرضی دیوؤں کی نقل اُتار رہی تھیں۔

آخر وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ اور یک بیک اُس کی موجودگی کا اُسے علم ہو گیا۔ جو اُس کے پیچھے اسطرح لگی ہوئی تھی۔ جیسے جنگل میں روشنی کے پیچھے سیاہی کا سلسلہ۔

اُس نے کرخت لہجے میں کہا "مجھے چھوڑ دو"۔ اور وہ اُس کے اوپر گر پڑی۔ تیز تیز سانس، بکھرے ہوئے بال، اور خاک پر لوٹتی ہوئی نقاب کے ساتھ اُس نے اُسے چومنا اور بلائیں لینی شروع کیں۔

عورت نے زور سے کہا "نہیں ہرگز نہیں اتم اپنے ہاتھوں سے مجھے مار ڈالو۔ اور اپنا گناہ میرے گناہ کے برابر ہو جانے دو"۔

جنگل کے سائے کانپ اُٹھے۔ اور درختوں کی خمیدہ جڑوں میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ایک دبی ہوئی آواز آئی! اور کسی چیز کے گرنے کا دھڑکا ہوا صبح کے وقت مندر کے مینار سے کسی دیوتا کی غضبناک نگاہ کی طرح روشنی پھیل رہی تھی۔ تب سوشن جنگل سے باہر آیا۔ وہ سنسان ریت پر ادھر اُدھر پھرتا رہا۔ اور دوپہر کے سورج نے اس کی حرارت سے اُس کے خون میں آگ لگا دی۔

دن کے اختتام پر وہ ایک بے خودی کے عالم میں کشتی پر واپس گیا۔ وہاں بستر پر غروب شدہ آفتاب کی آخری سنہری کرن کی طرح ایک پیر کا چھا پڑا ہوا تھا۔ اُس نے اُسے جلدی سے اُٹھا لیا۔ اور سینے سے لگایا۔ ایک گوشہ میں پڑی ہوئی آسمانی نقاب سے اُس نے اپنا مُنہ ڈھانپ لیا۔ اور اُسکی فریب زدہ خوشبو نے اُس کو اپنی ہستی میں جذب کرنیکی کوشش کی۔

رات زیادہ گئی۔ اور شفاف چاند دھندلے بادل کی وجہ سے پھیکا معلوم ہوتا تھا۔ سوشن کشتی میں کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے ہاتھوں کو

درختوں کی غصہ آمیز خاموشی کی طرف بڑھا کر کہا۔ آ۔ میری جان! تو پھر زندہ ہو جا۔ اور میرے پاس آجا۔"

معلوم نہیں وہ بھوت پریت تھا۔ یا کچھ اور جو کھلے ہوئے ریت کے میدان کے دھندلکے میں سے ظاہر ہوا؟ اُس نے کشتی پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ میں آ گئی تمہارے کریم ہاتھ موت کے کنارے پر لرز کر ناکام رہ گئے۔ اُس کی آنکھیں مشتاق ہوتی جا رہی تھیں۔ جب وہ اُس کو گھور رہا تھا۔ تو اُس نے اُسے اپنے سینے سے لگانے کے لئے بازو پھیلائے۔ تب کانپ کر وہ پیچھے ہٹا۔ اور بول اُٹھا۔ تم کیوں واپس آ گئیں؟ عورت ایک لمحے تک خاموش کھڑی رہی۔ تب وہ گھٹنوں کے بل اسکے سامنے جھکی۔ اور آہستہ سے اندھیرے میں چلی جانے کے لئے اُٹھی۔ مثل ایک خواب کے جو ذرا ذرا یاد آتا ہے۔ تاکہ رات کی فضا میں غائب ہو جائے۔
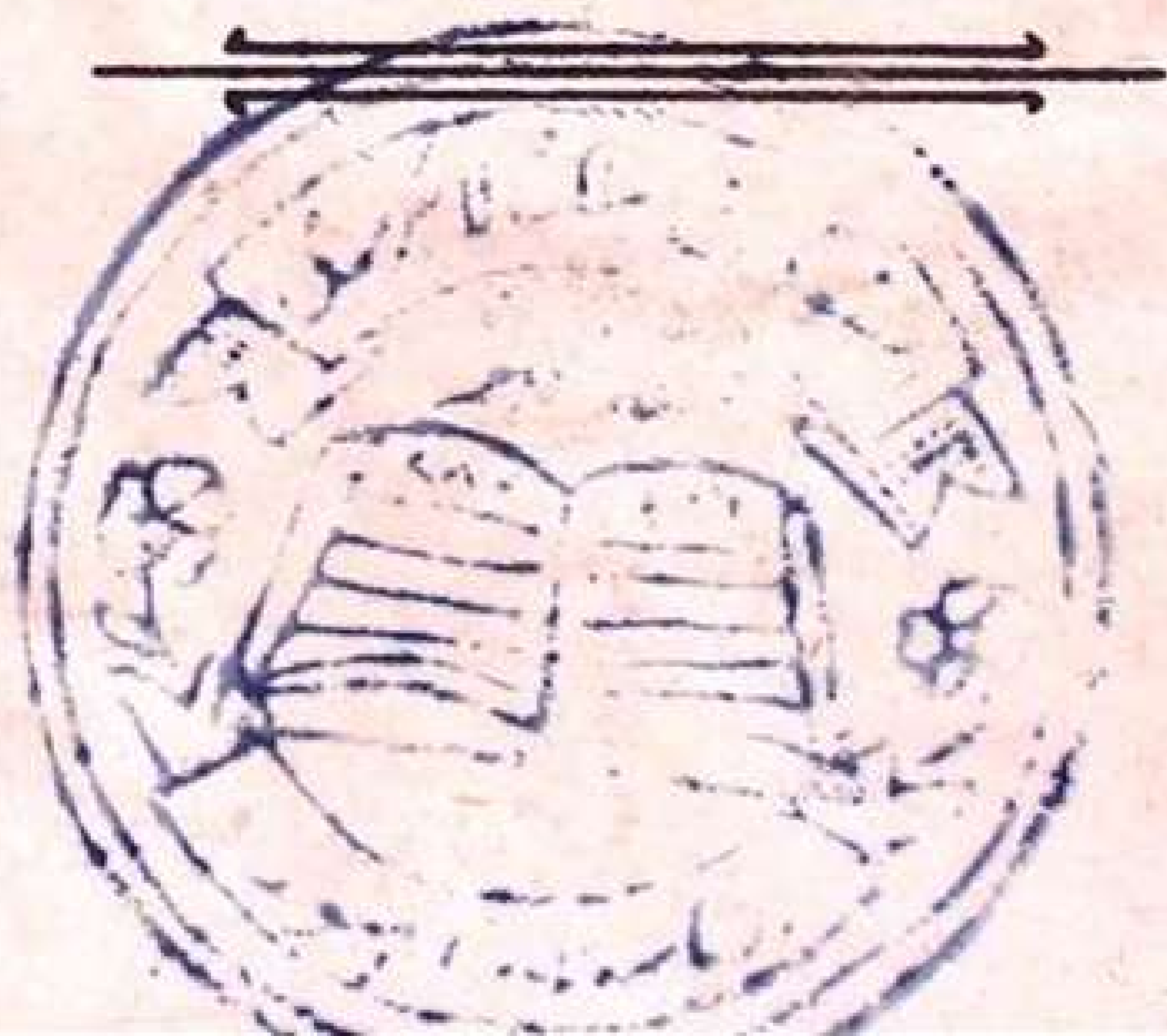
انتقامِ محبّت

برہسپتی چھوٹے دیوتاؤں کا اُستاد تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کچ کو دُنیا میں بھیجا تھا۔ کہ شنکر اچارج سے بقائے حیات کا راز حاصل کرے۔ کچ فارغ التحصیل ہو کر بہشت کو واپس جانے کے لئے تیار ہے۔ اس وقت وہ اپنے اُستاد کی بیٹی دیویانی سے الوداع کہنے کے لئے آیا ہے۔

کچ :۔ دیویانی! میں رخصت ہونے کے لئے آیا ہوں۔ تمہارے والد کے قدموں میں میری تعلیم ختم ہو چکی ہے۔ مہربانی کرو۔ اور مجھے بہشت کی واپسی کی اجازت دو۔ دیویانی :۔ تمہیں تمہاری مراد ملگئی۔ بقائے حیات کا وہ راز تمہیں معلوم ہو چکا جس کی دیوتاؤں کو ہمیشہ تمنا رہی ہے۔ لیکن ذرا خیال تو کرو۔ کہ کیا کوئی اور ایسی چیز نہیں ہے جسکی تم آرزو کر سکو۔

کچ :۔ کوئی نہیں۔

دیویانی۔ قطعاً نہیں؟ ذرا اپنے دل کو ٹٹولو۔ اور دیکھو شاید کوئی چھوٹی موٹی خواہش کہیں دبی پڑی ہو؟

کی روشنی زائل ہو چکی ہے۔ مجھے اب وہ راز معلوم ہو گیا جو رازِ حیات ہے۔

دیویانی:۔ تب تو تمام مخلوق میں تم سے زیادہ کوئی اور شخص خوش نہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ آج پہلی مرتبہ میں یہ محسوس کر رہی ہوں۔ کہ ایک اجنبی ملک میں قیام کرنا تمہارے لئے کس قدر باعثِ تکلیف تھا۔ اگرچہ یہ درست ہے۔ کہ بہتر سے بہتر چیز جو ہمارے حیطۂ امکان بھی تمہیں نذر کر دی گئی ہے۔

کچ:۔ اس کا چنداں خیال نہ کرو۔ اور خوش خوش مجھے جانے کی اجازت دو

دیویانی:۔ خوش ہو۔ اچھے دوست خوش ہو۔ کہ یہ تمہارا بہشت نہیں ہے اس دنیا میں جہاں پیاس سے زبان میں کانٹے پڑ جاتے ہیں ہنسنا اور مسکرانا کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ ہاں یہی دنیا جہاں ناکام تمنائیں احاطہ کئے ہیں۔ جہاں گم شدہ مسرت کی یاد میں رہ رہ کر کلیجے میں ہوک اٹھتی ہے۔ جہاں سرد آہوں سے پالا پڑتا ہے۔ تمہیں کہو، یہاں کوئی کیا ہنسے گا؟

کچ:۔ دیویانی! بتاؤ جلدی بتاؤ۔ مجھ سے کیا خطا ہوئی؟۔

دیویانی:۔ تمہارے لئے اس جنگل کو چھوڑنا آسان ہے۔ یہ وہی جنگل ہے۔ جس نے اتنے برس تک تمہیں اپنے سائے میں رکھا۔ اور تمہیں لوریاں دے دے کر تھپکایا کیا۔ تمہیں محسوس نہیں ہوتا۔ کہ آج ہوا کس قدر آہ وزاری کر رہی ہے۔ دیکھو درختوں کے متحرک سائے کو دیکھو۔ اسکے خشک پتوں کو

دیکھو۔ وہ ہوائیں جنگل نہیں کاٹ رہے۔ بلکہ کسی گم گشتہ اُمید کی طرح بھٹکے بھٹکے پھر رہے ہیں۔ ایک تم ہو کہ تمہارے ہونٹوں پر ہنسی کھیل رہی ہے۔ خوشی خوشی تم رخصت ہوتے ہو۔

کچ :۔ اُس جنگل کو میں کسی طرح مادرِ وطن سے کم نہیں سمجھتا۔ کیونکہ یہاں ہی میں گویا ازسرِ نو پیدا ہوا۔ اس کے لئے میری محبت کبھی کم نہ ہوگی۔

دیویانی :۔ وہ دیکھو سامنے برگد کا درخت ہے۔ جس نے دن کی سخت دھوپ میں جب کہ تم نے مویشیوں کو سبزہ زار میں چرنے کیلئے چھوڑ دیا تھا۔ تم پر شفقت سے سایہ کیا تھا۔

کچ :۔ اے جنگل کے نامدار آقا! میں تجھے سجدہ کرتا ہوں۔ جب اور لڑکے یہاں تعلیم کی غرض سے آئیں۔ اور شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور پتّوں کی سرسراہٹ کے ساتھ تیرے سائے میں بیٹھ کر اپنا سبق دُہرائیں تو مجھے بھی یاد رکھنا۔

دیویانی :۔ اور ذرا دمنتی کا بھی خیال کرو۔ جس کا صاف و شفاف تیز بہاؤ پانی گویا نغمۂ عشق کی ایک لہر ہے۔

کچ :۔ آہ! اُس کو میں ہرگز نہیں بھول سکتا۔ اسکی یاد ہمیشہ تازہ رہیگی دمنتی میری شریک غربت تھی دیہات کی ایک مصروف دوشیزہ کی طرح تبسم زیرِ لب کیساتھ اپنے سادہ گیت گنگناتے ہوئے وہ اپنی غیر مختتم خدمت کو انجام دیتی ہے۔

دیویانی :۔ لیکن پیارے دوست میں تمہیں یاد دلانا چاہتی ہوں۔ کہ تمہارا کوئی اور بھی ساتھی تھا۔ جس نے بے حد کوشش کی۔ کہ تم اس غربت زدہ زندگی کے تاثرات سے متاثر نہ ہو۔ یہ اور بات ہے۔ کہ یہ کوششیں بیکار ہوئیں۔

کچ :۔ اس کی یاد تو جزو حیات ہو چکی ہے۔

دیویانی :۔ مجھے وہ دن یاد ہے۔ جب تم اول مرتبہ یہاں آئے تھے۔ اس وقت تمہاری عمر ایک لڑکے سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ تمہاری آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ تم اس وقت اُدھر باغیچہ کی باڑ کے پاس کھڑے تھے۔

کچ :۔ ہاں ہاں اس وقت تم پھول چن رہی تھیں۔ تمہارے جسم پر سفید لباس تھا۔ ایسا نظر آتا تھا۔ گویا جلوۂ صبح نے اپنی تجلی میں غسل کیا ہے تمہیں شاید یاد ہو گا۔ میں نے کہا تھا۔ کہ اگر میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں تو میرے لئے باعثِ افتخار ہو گا۔

دیویانی۔ یاد کیوں نہیں! میں نے حیرت سے دریافت کیا تھا۔ اور تم کون ہو؟ اور تم نے نہایت ملائمت سے جواب دیا تھا۔ کہ تم اندر کے دربار کے مشہور و معروف دلی بر ہسپتی کے فرزند ہو۔ نیز تم نے بیان کیا تھا۔ کہ تم میرے والد سے وہ راز معلوم کرنا چاہتے ہو۔ جس سے مُردے زندہ ہو سکتے ہیں۔

کچ :۔ مجھے اندیشہ تھا۔ کہ شاید تمہارے والد مجھے اپنی فناگردی میں قبول نہ کریں۔

دیویانی :۔ لیکن جب میں نے تمہاری سفارش کی۔ تو وہ اس درخواست

کو رد نہ کر سکے۔ ان کو اپنی بیٹی سے اتنی زیادہ محبت ہے۔ کہ اسکی وہ کوئی بات نہیں ٹال سکتے۔

کچ :- اور جب میں تین دفعہ مخالفوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ تو تمہیں نے اپنے والد کو مجبور کیا تھا۔ کہ مجھے دوبارہ زندہ کریں۔ میں اس احسان کو ہرگز نہیں بھول سکتا۔

دیویانی :- احسان ؟ اگر تم اس کو بھول جاؤ گے۔ تو مجھے ہرگز ملال نہ ہوگا کیا تمہاری یاد صرف فائدے ہی پر نظر رکھتی ہے ؟۔ روزانہ سبق کے بعد شام کے دھندلکے اور سناٹے میں اگر غیر معمولی خوشی اور مسرت کی لہریں تمہارے دل پر گزری ہوں۔ تو اُن کو یاد رکھو۔ احسان کو یاد رکھنے سے کیا فائدہ ؟ اگر کبھی تمہارے قریب سے کوئی گزرا ہو جس کے نغمہ کا ایک چبھتا ہوا ٹکڑہ تمہارے سبق میں اُلجھ گیا ہو، یا جس کے ہوا میں لہراتے ہوئے دامن نے تمہاری وجہ سے سبق کو اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔ اپنی فرصت کے وقت میں کبھی اسکو ضرور یاد کر لینا۔ مگر صرف یہی کچھ اور نہیں حسن و عشق کا یاد آنا ہی اچھا ہے۔

کچ :- بہت سی چیزیں ہیں۔ جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتیں۔

دیویانی :- ہاں۔ ہاں ! میں جانتی ہوں۔ میری محبت سے تمہارے دل کا انتہائی گوشہ تک چھد چکا ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ میں بلا جھجک اس امر کا اظہار کر رہی ہوں۔ تمہاری احتیاط اور گم گوئی مجھے مرعوب نہیں کر سکتی تمہیں

مجھ سے جدا ہونا مناسب نہیں۔ یہیں قیام کرو۔ کچھ شہرت ہی ذریعہ مسرت نہیں ہے۔ اب تم مجھ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ تمہارا راز بھی مجھ پر کھل چکا ہے

کچ:۔ نہیں! دیویانی نہیں! ایسا نہ کہو۔

دیویانی:۔ کیا کہا! نہیں؟ مجھ سے کیوں جھوٹ بولتے ہو؟ محبت کی نظریں چھپی نہیں رہتیں۔ ہر روز تمہارے سر کی خفیف حرکت سے تمہاری للچائی ہوئی نظروں سے تمہارے ہاتھوں کی تھرتھراہٹ سے تمہارا دلی عندیہ مجھ پر ظاہر کرتا رہا ہے جس طرح سمندر اپنی موجوں کے ذریعہ سے کلام کرتا ہے۔ اسی طرح تمہارے دل نے ان حرکات و سکنات کے ذریعے سے مجھ تک پیام پہنچایا۔ اچانک میری آواز سنکر جو تم تلملا اٹھے تھے۔ کیا تم سمجھتے ہو۔ کہ مجھے تمہاری اس کیفیت کا احساس نہیں ہوا؟ میں تمکو خوب جانتی ہوں۔ اور اس لئے اب تم ہمیشہ کے لئے میرے ہو۔ تمہارے دیوتاؤں کا بادشاہ بھی اس رشتے کو نہیں توڑ سکتا۔

کچ:۔ لیکن دیویانی! انہیں کہو۔ کیا اتنے برس تک اپنے گھر اور اپنے لوگوں سے الگ رہ کر میں نے اسی لئے محنت کی تھی؟۔

دیویانی:۔ کیوں نہیں؟۔ کیا تم سمجھتے ہو۔ کہ دنیا میں علم کی قیمت ہے اور محبت کی کوئی قیمت ہی نہیں؟ وقت کو ضائع نہ کرو۔ ہمت و جرأت سے کام لو اور اس بات کا اقرار کرو۔ کہ طاعت، علم اور شہرت کے حصول کے لئے انسان جو

ریاضت اور نفس کشی کرتا ہے۔ اس کی ایک عورت کے دل کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں۔

کچ :۔ تم واقف ہو۔ کہ میں نے صدق دلی کے ساتھ دیوتاؤں سے عہدہ کیا۔ کہ میں بقائے حیات کا راز حاصل کر کے اُنکی خدمت میں حاضر ہوں گا۔

دیویانی :۔ مگر کیا تم کہہ سکتے ہو۔ کہ تمہاری آنکھوں نے کتابوں کے سوا کسی اور چیز پر نظر نہیں ڈالی؟ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو۔ کہ مجھے پھول نذر کرنے کیلئے تم نے کبھی اپنی کتابوں کو نہیں چھوڑا؟ کیا تمہیں کبھی ایسے موقع کی تلاش نہیں رہی کہ شام کو میری پھلواڑی کے پھولوں پر پانی چھڑک سکو؟ شام کے وقت جب ندی پر تاریکی کا سائبان تن جاتا تھا۔ گویا محبت اپنی غمناک خاموشی پر محیط ہو جاتی تھی۔ تم گھاس پر میرے برابر بیٹھ کر مجھے اپنے بہشت کے گیت گا گا کر کیوں سناتے تھے؟ کیا یہ کارروائیاں ان سازشانہ چالاکیوں کا ایک حصہ تھیں۔ جو تمہاری بہشت میں جائز ہیں؟ کیا ان بناوٹی ذرائع سے تم نے میرے والد کو رام کرنا چاہا؟ اور اب رخصت کے وقت شکریہ کے چند ارزاں قیمت کے سکے اُس خادمہ کی طرف پھینکتے ہو۔ جو تمہارے دم جھانسے میں آچکی ہے۔

کچ :۔ مغرور عورت! اصلیت معلوم کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر یہ میری غلطی تھی۔ کہ میں نے ایک خاص جذبۂ محبت کے ساتھ تیری خدمت کی۔ تو

مجھے اُس کی سزا مل گئی۔ لیکن ابھی وہ وقت آیا۔ کہ میں اس سوال کا جواب دے سکوں۔ کہ آیا میری محبت حقیقی تھی۔ یا کیا۔ کیونکہ مجھے اپنی زندگی کا کام سامنے نظر آرہا ہے۔ اب خواہ میرے دل سے آتشیں شعلے اُٹھ اُٹھ کر عالم فضا کو ڈھانپ لیں۔ تاہم میں بہشت کو ضرور واپس جاؤں گا۔ اس کا مجھے خود اقرار ہے۔ کہ بہشت اب میرے لئے بہشت نہیں رہا۔ دیوتاؤں کی خدمت میں یہ راز سربستہ پہنچانا میرا فرض ہے۔ جس کو میں نے سخت محنت کے بعد حاصل کیا ہے۔ اس سے قبل مجھے ذاتی مسرت کے حصول کا خیال ہرگز نہیں ہوسکتا۔ معاف کر! میں خلوص دل سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اس بات کو یقین جان کہ تجھے صدمہ پہنچا کر میں نے اپنی اذیت و تکلیف کو دُگنا کر لیا ہے "

دیویانی:۔ معافی! اب تم نے میرے دل کو پتھر کی مانند سخت کر دیا ہے۔ وہ طوفان کی طرح غصے میں بھک رہا ہے۔ تم اپنے کام پر واپس جا سکتے ہو۔ مگر میرے لئے کیا باقی رہا ؟ صرف یاد کا ایک خار دار بستر اور ایک چھپی ہوئی شرم، جو ہمیشہ میری محبت کا مضحکہ اڑائے گی۔ تم ایک راہ گیر کی صورت میں یہاں آئے۔ دھوپ سے بچنے کے لئے میرے درختوں کے سائے میں پناہ لی۔ اور اپنا وقت گزارا۔ تم نے میرے باغ کے تمام خوشنما پھول توڑ کر ایک ہار گوندھا۔ اور اب جبکہ چلنے کا وقت آیا۔ تم نے دھاگا

توڑ دیا۔ اور پھولوں کو خاک میں بکھیر دیا۔ میں تجھ کو جلے دل سے بد دُعا دیتی ہوں۔ کہ جو علم تو نے حاصل کیا ہے۔ وہ تجھ پر بھاری ہو جائے۔ دوسرے لوگ اس علم کو تجھ سے حاصل کریں گے۔ مگر جس طرح ستارے رات میں کنواری تاریکی سے نسبت قائم نہیں کرتے۔ بلکہ الگ رہتے ہیں۔ اُسی طرح تیرا یہ علم بھی تیری زندگی سے الگ رہے گا۔ ذاتی طور پر تجھے اس سے کوئی فیض نہ پہنچے گا۔ اور یہ صرف اس لئے کہ تو نے محبّت کی قدر نہیں کی۔

انقلابِ زندگی

رسک بہاری رئیس کا لڑکا ہے۔ وہ جتنا خرچ کرنا جانتا ہے۔ اُتنا تو کیا۔ اُس کا چہارم بھی کمانا نہیں جانتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پشتینی امارت خاک میں مل گئی۔ اور جب پونجی تمام ہو چکی۔ تو کسبِ معاش کے لئے دوسروں کا سہارا ڈھونڈھنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔

رسک بہاری خوبصورت تھا۔ جوان تھا۔ گانے بجانے میں ماہر اور کام کاج میں بالکل کورا۔ دُنیا کے لئے اس کا عدم وجود برابر تھا۔ پہلے جب وہ صبح و شام ہوا خوری کے لئے نکلتا تھا۔ تو بڑے ٹھاٹھ سے نکلتا تھا۔ اب وہ ٹھاٹھ کہاں؟ اب تو روٹیوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ وجہ یہ کہ اُس نے کوئی ہنر ایسا نہیں سیکھا تھا جس کے ذریعے سے وہ چار پیسے کما سکتا۔ آخر کار گھر بار چھوڑ کر باہر نکلنا پڑا۔

اس کو رسک بہاری کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے۔ کہ اسی اثناء میں راجہ اشیور سنگھ کا علاقہ کورٹ آف وارڈس نے انہیں واگزار کر دیا پھر گیا تھا۔ نئی نئی سوجھنے لگی۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنی تفریح کے لئے اور

عیش کرنے کے لئے ایک تھیٹریکل کلب قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ گھومتے پھرتے رسک بہاری کی بھی راجہ صاحب کی خدمت میں رسائی ہو گئی۔ ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ رسک بہاری خوبصورت جوان تھا۔ کسی قدر اس کو شعر گوئی کا بھی شوق تھا۔ گانے میں اُسکی آواز نہایت سُریلی تھی۔ راجہ صاحب اُس کے کمال پر لٹو ہو گئے۔ اُس کی بیحد خاطر تواضع کی۔ اور اپنے مصاحبین میں اُسکو بھی شامل کر لیا۔

راجہ صاحب بی۔ اے پاس تھے طبیعت میں مطلق غرور نہ تھا۔ ان میں اپنی من مانی کرنے کی عادت نہ تھی۔ بڑے آدمی کی اولاد ہونے پر بھی انکے عادات و اطوار ایک خاص اصول کے پابند تھے۔ انہیں ہر بات میں پابندیٔ وقت کا خیال رہتا تھا۔ لیکن رسک بہاری کے "باریاب" ہوتے ہی راجہ صاحب کے معمولات میں فرق آنے لگا۔ ان کا زیادہ تر وقت رسک بہاری کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے اور اس کی ایکٹنگ پر تبصرہ کرنے میں صرف ہو جاتا۔ کھانے پینے کا انہیں خیال ہی نہ رہتا۔ سونے کے اوقات میں بھی فرق واقع ہو گیا۔ دیوان صاحب نے فرمایا۔ "راجہ صاحب میں اگر کوئی نقص ہے۔ تو یہی کہ وہ رسک بہاری پر بہت ریجھ گئے ہیں"۔

رانی صاحبہ روٹھ کر کہتیں۔ نہ جانے یہ بلا کہاں سے آ چمٹی ہے۔ اس کمبخت

کی باتوں میں آکر آپ اپنی صحت کو خراب کر رہے ہیں۔ اسکو الگ کیجئے۔
راجہ صاحب اپنی نوجوان بیوی کی زبان سے شکوہ و شکایت سنکر
بہت خوش ہوتے تھے۔ دل میں سوچتے۔ عورتیں جسکو پیار کرتی ہیں۔
اُسی کو اچھا جانتی ہیں۔ انکے مذہب میں یہ روا نہیں ہے۔ کہ دُنیا میں
جو اور قابل قدر ہستیاں ہیں۔ ان کی عزت و توقیر کی جائے۔ ان کی نظر میں
شوہر ہی ایک ہستی ہے۔ جس کی عزت ہونی چاہیئے۔ بھوجن کرنیکے لئے
آنے میں شوہر کو گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی دیر ہو جائے۔ تو اُن سے برداشت
نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ بھی تو خیال کرنا چاہیئے۔ کہ اگر شوہر کے کسی خاص
آدمی کو الگ کر دیا جائے۔ تو شوہر کا کیا حال ہوگا؟

رانی صاحبہ کی باتوں سے راجہ صاحب ناخوش نہیں ہوئے۔ بلکہ اُس
کے بعد کبھی کبھی وہ رسک بہاری کی بیحد تعریفیں کرکے رانی صاحبہ کو چھیڑ
کرتے اور ان کے بگڑنے پر دل ہی دل میں خوش ہوا کرتے۔

میاں بیوی کا یہ راز و نیاز رسک بہاری کے حق میں بہم نقصان دہ ثابت
ہوا۔ رانی صاحبہ کی ناراضگی کا یہ نتیجہ نکلا۔ کہ رسک بہاری کے کھانے پینے میں
گڑبڑی ہونے لگی۔ رئیسوں کے ملازم بالعموم اس قسم کے مفت خوروں
کے خلاف رہتے ہیں۔ رانی صاحبہ کی شہ پاتے ہی اُنکے دل سے رسک بہاری
کی رہی سہی عزت بھی جاتی رہی۔ اس کا ہر کام کرنے میں ٹال مٹول کرنے لگے

رانی صاحبہ نے ایک دن ہنوا (خدمتگار چھوکرا) کو ڈانٹ ڈپٹ کر دریافت کیا: "تو کہاں غائب رہتا ہے۔ کام کے وقت تیرا کہیں پتہ ہی نہیں۔"
اُس نے جواب دیا "سرکار! صاحب کا حکم ہے۔ کہ میں ہر وقت رسک بہاری کی خدمت میں حاضر رہا کروں۔"

رانی صاحبہ نے فرمایا "نہایت احمق لڑکا ہے۔ اسے تمام دن وہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ رسوئی بنا کر چلا آیا کر۔"

اس کے بعد دوسرے ہی دن سے یہ کیفیت ہو گئی۔ کہ گھنٹوں جھوٹے برتن پڑے رہتے۔ مکھیاں بھنبھنایا کرتیں۔ رسک بہاری بار بار آواز دیتا مگر ہنوا نہ آتا۔ ایک کام کے لئے سو سو بار کہنا پڑتا۔ اگرچہ عادت نہ تھی لیکن کبھی کبھی رسک بہاری کو خود ہی چوکا برتن کرنا پڑتا۔ بعض مرتبہ ٹالمٹول کر جاتا اور بھوکا ہی پڑا رہتا۔ اس کے متعلق راجہ صاحب سے کچھ کہنا سننا اسکی طبیعت کے خلاف تھا۔ ملازمین سے بھی وہ کچھ نہیں کہتا تھا۔ کہ مبادا اُلٹا جواب دے بیٹھیں۔ غرضیکہ عجیب حالت تھی۔ ایک طرف اسکی عزت بڑھ رہی تھی۔ اور دوسری طرف بے وقعتی۔

اِدھر "سبھدرا ہرن" (کھیل کا نام ہے) کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ پارٹ کرنے والے لوگ تیار ہو گئے۔ راجہ صاحب کی بڑی بارہ دری میں دسہرہ کے دن کھیل ہوا۔ اس کھیل میں راجہ صاحب نے کرشن کا پارٹ لیا۔

اور رسک بہاری نے ارجن کا۔ تماشائی ارجن کے "کام" سے بہت محظوظ ہوئے۔ "واہ واہ! جیسا گلا ہے۔ ویسا ہی روپ ہے!" صفحچی میں رانی صاحبہ بھی فروکش تھیں۔ سامنے چلمن پڑی تھی۔

رات کو راجہ صاحب نے رانی صاحبہ سے دریافت کیا "کہو کھیل کیسا ہوا؟" رانی صاحبہ نے جواب دیا:۔ "آپ کا رسک تو خوب ارجن بنا تھا۔ صورت شکل سے کسی بڑے گھر کا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی آواز بھی دلکش ہے۔ راجہ صاحب اس سے قبل بڑے پُرجوش الفاظ میں رسک بہاری کی تعریف کئے بلا حد چکے ہیں۔ لیکن آج رانی صاحبہ کے مُنہ سے اس کی تعریف سُنکر انہیں یہ محسوس ہوا۔ کہ رسک بہاری کو گانے بجانے میں جتنی مہارت ہے۔ اس سے کہیں زیادہ جاہل اور بیوقوف اس کو اہمیت دیتے ہیں اس کے چہرے میں بھی کوئی خصوصیت نہیں۔ اور نہ اُس کی آواز ہی میں کوئی خاص دلکشی پائی جاتی ہے۔" کچھ روز پہلے راجہ صاحب کا شمار بھی انہی بے وقوفوں اور جاہلوں میں تھا۔ لیکن ایک ہی دن میں اُنکی کایا پلٹ ہوگئی۔"

کھیل کے دوسرے ہی دن سے رسک بہاری کے کھانے پینے کا خاص انتظام ہوگیا۔ رانی صاحبہ نے راجہ صاحب سے کہا۔ رسک بہاری کو رہنے کے لئے کوئی اچھا مکان دینا چاہیئے۔ باہر کی کوٹھڑی میں اسکو تکلیف ہوتی ہوگی۔ آخر ہے تو وہ کسی رئیس کا لڑکا۔"

راجہ صاحب نے "ہاں" کہہ کر بات اُڑا دی۔

رانی صاحبہ نے خواہش ظاہر کی۔ کہ راجکمار کی سالگرہ کے موقعہ پر بھی ناٹک کیا جائے۔ لیکن راجہ صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گویا سُنا ہی نہیں۔

ایک دن راجہ صاحب نے بتوا کو ڈانٹ بتائی۔ کہ "فلاں کام کیوں نہیں ہُوا؟"

اُس نے جواب دیا۔ رانی صاحبہ کے حکم سے دن رات رسک بہاری بابو کی خدمت میں حاضر رہتا ہوں۔

راجہ صاحب نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "ہش! رسک بابو کہاں کے نواب ہیں؟ کیا اپنا کام وہ خود نہیں کر سکتے ہیں؟"

رسک بہاری کا پھر وہی حال ہو گیا۔

رانی صاحبہ نے راجہ صاحب سے کہا۔ جہاں بیٹھ کر آپ رسک بہاری کا گانا سُنا کرتے ہیں۔ میں بھی وہاں چلمن کی آڑ میں بیٹھ کر گانا سننا چاہتی ہوں۔ مجھے رسک کا گانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

راجہ صاحب اسی دن سے ٹھیک ہو گئے۔ وقت پر کھانا، وقت پر سونا۔ غرض ہر کام اپنے وقت پر ہونے لگا۔ گانا بجانا بند ہو گیا۔

دوپہر کے وقت راجہ صاحب زمینداری کے کاغذات دیکھا کرتے تھے ایک دن انہیں اس کام سے جلد فرصت مل گئی۔ محل میں گئے۔ اور اندر جا کر دیکھا کہ رانی صاحبہ کچھ پڑھ رہی ہیں۔ دریافت کیا یہ کیا پڑھ رہی ہو؟"

رانی صاحبہ نے شرمندہ ہوکر جواب دیا۔" لونڈی کو بھیج کر میں نے رسک بابو کے" گانے کی کتاب منگائی تھی۔ اسی کو پڑھ رہی ہوں۔ ایک آدھ گیت یاد کرونگی۔ تمہارا شوق تو ایک دم جاتا رہا۔ اب گانا سننے کو کیوں ملنے لگا۔"

اُسی وقت رانی صاحبہ کو کسی نے یہ بات یاد نہیں دلائی۔ کہ ایک دن تم نے بھی اس شوق کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی تھی۔

دوسرے ہی دن راجہ صاحب نے بابو رسک بہاری کو رخصت کر دیا انہیں اس بات کا مطلق خیال نہیں ہوا۔ کہ یہ مبتلائے مصیبت اور کھلے آدمی کا لڑکا کل کیا کھائے گا؟

لیکن رسک بہاری کو کچھ اس سے زیادہ غم تھا۔ اتنے دن تک ساتھ رہنے سہنے کے باعث وہ راجہ صاحب کی محبت پر مرتا تھا۔

رسک بہاری نے بہت خیال کیا۔ مگر اس کو کوئی ایسی بات یاد نہیں آئی جس کے باعث راجہ صاحب ناراض ہوگئے ہیں۔ اس نے ایک لمبی اور سرد آہ بھر کر اپنے تنبورہ پر غلاف چڑھایا۔ اور اس کو بغل میں دبا کر چل نکلا۔ اُس کے پاس صرف دو روپے تھے۔ چلتے وقت وہ دونوں بنتوا کو انعام میں دے دئے۔

گنگا کا گھاٹ

(۱)
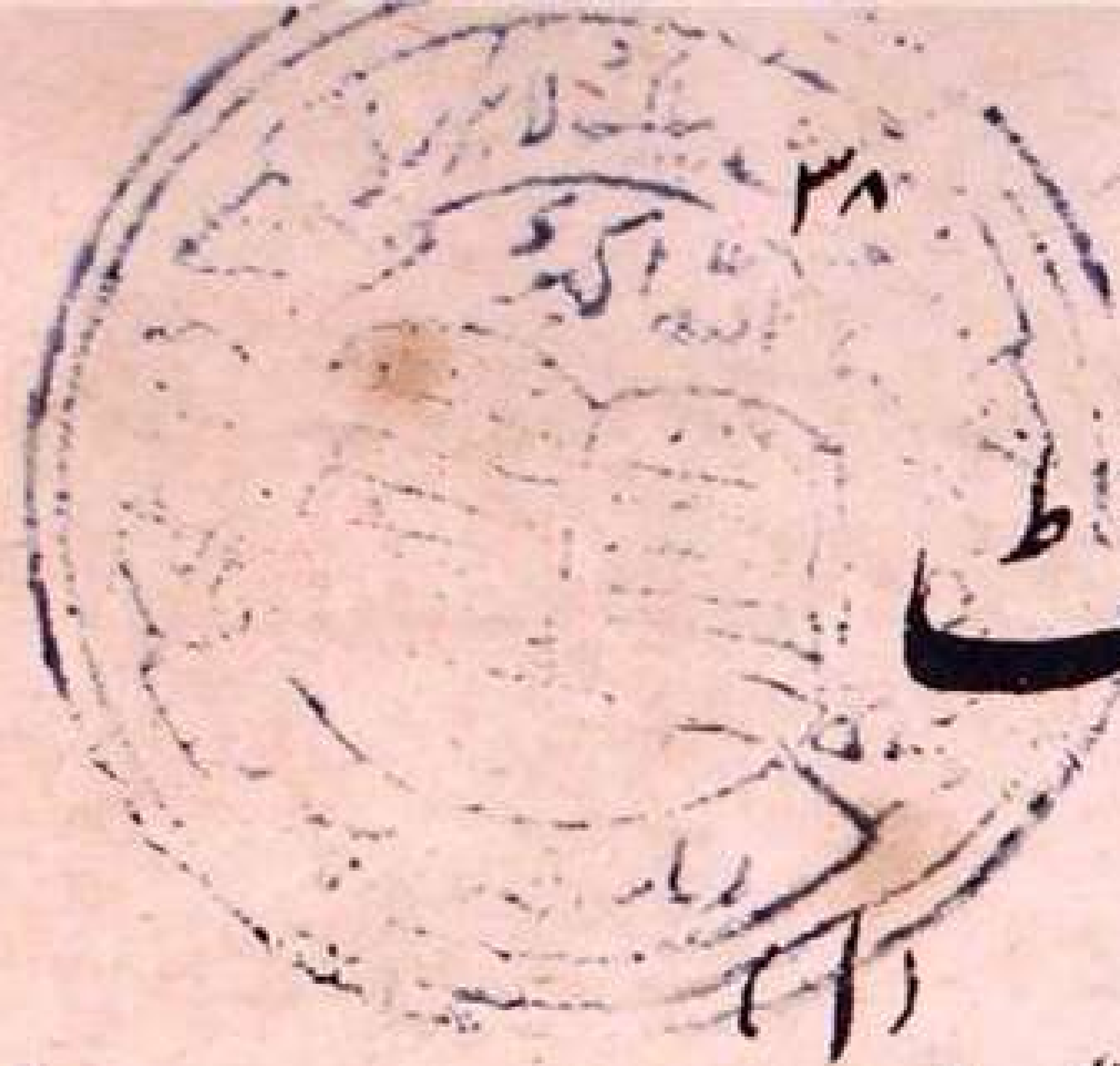
گنگا کا گھاٹ اپنی سرگزشت زبانِ حال سے اس طرح بیان کرتا ہے:۔

دریا زور شور سے بہ رہے تھے۔ چار کے سوا میری سب سیڑھیاں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اگر تم میری سرگزشت سُننا چاہتے، اور ان کھلی ہوئی سیڑھیوں میں سے ایک پر بیٹھ جاتے۔ جو پانی اور خشکی کے درمیان حدِ فاصل تھیں۔ تو گزرے ہوئے زمانے کی ہزاروں داستانیں سُنائی دیتیں۔ میرے ساحل کے سیر آب نشیبی حصّوں میں سرسبز اور شاداب آم کے درخت جھوم رہے تھے۔ جن کے نیچے کا چو کے پودے ایسے نظر آتے تھے جیسے اپنی پیاری ماں کی گود میں پیارے بچے، دریا کے ایک جانب اینٹوں کے تین ڈھیر جزیروں کی طرح نظر آتے تھے۔ شکاریوں کی کشتیاں درختوں سے بندھی ہوئی لہروں میں جھول رہی تھیں۔ موسمِ خزاں کا آغاز تھا۔ دھوپ صاف شفاف پانی کے آئینے میں حسین چمپئی چہرے کی طرح اپنا حسن دکھا رہی تھی۔ رام رام کا جپ کرتے ہوئے ملّاحوں نے کشتیوں کے لنگر اُٹھا دیئے ہیں اور ان چھوٹی کشتیوں کے بادبان آفتاب سے منوّر پانی کی سطح پر اُڑے

جا رہے ہیں۔ جس طرح پرندے نیلگوں آسمان میں اپنے پر پھیلائے ہوئے خوش خوش روشنی کی طرف جا رہے ہوں۔ ان کشتیوں کو آسانی کے ساتھ پرندوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ وہ ابابیلوں کی طرح میری چھاتی پر دوڑ رہی ہیں۔ صرف ان کے بازو ہوا میں اڑتے ہیں۔

برہمن دیوتا ٹھیک وقت پر اپنا پوجا کا سامان لئے ہوئے اشنان کرنے آپہنچا ہے۔ اور عورتیں دو دو تین تین کی ٹولیوں میں پانی بھرنے آ رہی ہیں۔

دیکھیئے وہ چکرورتی خاندان کی دادی صبح کا اشنان کر کے سردی میں ٹھٹھرتی ہوئی جپ کرتی گھر کو جا رہی ہے۔ مگر اس بڑھیا مائی کی دادی کسی زمانے میں ایک ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ جو ہر روز گھرنٹ کماری کی پتے دریا میں بہا کر خوش ہوا کرتی تھی۔ اور میرے دائیں طرف دریا میں چھوٹا سا بھنور رہے۔ اسمیں ان پتوں کو چکر کاٹتے ہوئے دیکھتی رہتی تھی۔ تھوڑے عرصے بعد وہ بچوں کی ماں بن گئی۔ اور اپنی چھوٹی لڑکی کے ساتھ پانی بھرنے آیا کرتی تھی۔ تھوڑے دن اور گزرے ہوں گے۔ کہ وہ لڑکی بھی جوان ہو گئی اور اب وہ ان چھوٹی لڑکیوں کو سزا دیتی اور نصیحت کیا کرتی تھی۔ جو دریا میں کلیلیں کرتی یا پانی کے چھینٹے اڑایا کرتی تھی۔ اس وقت کہانی میں تمہیں سُنانا چاہتا ہوں۔ تو فوراً ہی دوسرا واقعہ دھیان میں آ جاتا ہے۔

ہاں، ایک دو واقعات ایسے بھی ہیں۔ جو گھرنٹ کماری کے پتوں کی

کشتیوں کے بھنور میں چکر کھانے کی طرح بار بار مجھے یاد آجاتے ہیں ایسا ہی ایک واقعہ آج میرے دل پر چکر لگا رہا ہے۔ اور وہ اپنی داستان سنانے کو بیتاب ہے۔

(۲)

مندر کے قریب جہاں تم گوسائیں کی گئوشالہ کو دیکھتے ہو۔ برگد کا درخت تھا۔ ہفتے میں ایک روز یہاں میلہ لگا کرتا تھا۔ اس زمانے گوسائیں نے یہاں سکونت اختیار نہیں کی تھی۔ صرف درختوں کے پتوں سے چھایا ہوا ایک چھپر تھا۔ جہاں آجکل وہ عظیم الشان مندر بنا ہوا ہے۔ یہ برگد کا درخت جس نے اپنی لمبی اور سخت جڑوں کی انگلیوں سے میرے شکستہ سنگین دل کو دبا لیا ہے۔ اس زمانے میں ایک ننھا سا پودا تھا۔ اس نے ابھی سر نکالا ہی تھا دھوئیں کے وقت اس کے پتوں کا سایہ میری سطح پر کھیلا کرتا تھا۔ اور اسکی نرم نرم جڑیں بچے کی انگلیوں کی طرح میرے سینے سے چمٹی رہتی تھیں۔ اگر کوئی شخص اس کا پتہ بھی توڑتا۔ تو مجھے صدمہ ہوتا تھا۔ اگرچہ میں بڈھا تھا تاہم اس وقت سیدھا کھڑا تھا۔ اب میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اور تمام انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ ہزار ہا سلوٹیں میرے جسم پر پڑ گئی ہیں۔ دنیا بھر کے مینڈکوں نے جاڑوں کی لمبی نیند کے لئے میرے سوراخوں میں گھر بنا لیا ہے اس زمانے میں میری یہ افسوسناک حالت نہ تھی۔ میرے بائیں پہلو سے صرف دو اینٹیں

گری تھیں جنکی وجہ سے سوراخ بن گیا تھا۔ جسمیں ایک چڑیا نے گھونسلہ بنا لیا تھا طلوع آفتاب کے وقت جب وہ بیدار ہوتی۔ تو مچھلی کی طرح اپنی دُم کو اِدھر اُدھر حرکت دے کر گاتی ہوئی اُڑ جاتی۔ اُسوقت مجھے معلوم ہو جاتا۔ کہ ایک چھوٹی لڑکی کسم اشنان کرنے آنے والی ہے۔

دوسری لڑکیاں اُسے کسم کہتی تھیں۔ کیونکہ یہی اس کا نام تھا جب اُس کے چھوٹے سے جسم کا عکس پانی پر پڑتا۔ تو میری یہ آرزو ہوتی۔ کہ وہ دیر تک قائم رہے۔ اور وہ میرے دل پر نقش ہو جائے۔ وہ ایسی سندر تھی۔ کہ جب وہ اپنا قدم میری سطح پر رکھتی۔ اور اُس کے چاروں بچھوؤں کا جھنکار پیدا ہوتی۔ تو میرے کائی بھرے ہوئے دامن میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ نہ تو وہ زیادہ کھیلتی تھی۔ نہ زیادہ بولتی تھی۔ اور نہ حد سے زیادہ خوش طبع تھی۔ لیکن ایک بات عجیب تھی۔ کہ اسکی سہیلیاں بیشمار تھیں۔ تمام طرار لڑکیاں اسکے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ بعض اُسکو کسی کے نام سے پکارتی تھیں۔ بعض اسکو خوشی کہتی تھیں۔ بعض راکھشنی۔ مگر اس کی ماں اس کو کسمی کہا کرتی تھی۔ میں نے اس لڑکی کو اکثر پانی کے کنارے بیٹھا دیکھا۔ وہ پانی کے نظارے کی بہت مشتاق تھی۔ کچھ عرصے بعد کسم نے دریا پر آنا بند کر دیا۔ اسکی دو سہیلیاں بھوبن اور سوارن ایک روز گھاٹ پر بیٹھی ہوئی اسکی جدائی کا افسوس کر رہی تھیں۔ وہ کہتی تھیں۔ کہ کسم اپنے شوہر کے گھر چلی گئی ہے۔ وہ جگہ دریا سے بہت دور ہے۔ جہاں بالکل

اجنبی جگہ اجنبی رستے اور اجنبی آدمی ہیں۔ گویا ایک کنول کے پودے کو خشک باغ میں لگانے کو لے گئے ہیں۔

اس بات کو ایک سال گزر گیا۔ گھاٹ پر آنے والی عورتیں اب کسم کا بہت کم ذکر کرتی تھیں۔ ایک شام کو اچانک میں نے ان قدموں کو محسوس کیا۔ جن سے میں عرصہ دراز تک آشنا رہا تھا۔ میں نے خیال کیا۔ کہ یہ کسم کی چال ہے۔ بیشک وہی تھی۔ مگر افسوس ہے۔ کہ اسکے پاؤں اب بچھوؤں سے خالی تھے۔ اسکی رفتار کی وہ خوشگوار آواز جاتی رہی تھی۔ چونکہ میں بہت دنوں تک بچھوؤں کی جھنکار کے ساتھ اُس کے پاؤں کی آہٹ سُنتا رہا تھا۔ جب اُس روز وہ مجھے سنائی نہ دی۔ تو پانی کی گڑگڑاہٹ میرے کانوں میں صدائے ماتم محسوس ہوئی۔ اور آم کے جھنڈوں میں پتوں کی سرسراہٹ ہوا کی آہ وزاری معلوم ہونے لگی۔

(۳)

کسم اب بیوہ ہوگئی تھی۔ لوگ کہتے تھے۔ اُس کا شوہر کسی دور دراز جگہ پر ملازم تھا۔ اور وہ اُس سے صرف ایک دو دفعہ ملی تھی دفعتاً ایک چِٹھی اُس کے شوہر کی وفات کی خبر لائی۔ اور آٹھ سال کی عمر میں وہ لڑکی بیوہ ہو گئی اُس نے سیندور ماتھے سے اُتار دیا۔ جو سہاگ کی نشانی ہوتی ہے۔ تمام زیور بڑھا دیا۔ اور اپنے والد کے گھر چلی آئی۔ لیکن اُس نے اپنی بہت کم

سہیلیوں کو یہاں پایا۔ بھوبن، سوارن اور اِملا کی شادی ہو چکی تھی۔ اور وہ اپنی سسرال چلی گئی تھیں۔ صرف سرِت باقی تھی لیکن دسمبر میں اس کی بھی شادی ہونے والی تھی۔ اب کسم بالکل تنہا تھی۔ وہ اکثر اپنا سر زانوؤں پر رکھے ہوئے چپ چاپ میری سیڑھیوں پر بیٹھی رہتی تھی۔ اور میں خیال کرتا تھا۔ کہ دریا کی لہریں اسے کسم کسم کہہ کر پکارتی تھیں۔ جسطرح موسم برسات میں گنگا پورے چڑھاؤ پر آجاتی ہے اسی طرح کسم روز بروز حسن و شباب میں ترقی کرنے لگی لیکن اسکی ساری، اس کے اداس چہرے اور خاموش رویہ نے اسکی جوانی اور شباب کو عوام کی نگاہ سے چھپا لیا تھا کسی نے خیال نہ کیا کہ کسم جوان ہو گئی ہے۔ بلکہ مجھے بھی ذرا محسوس نہ ہوا۔ میرے لئے تو وہی چھوٹی سی لڑکی تھی۔ جو پہلے تھی۔ اسکے پاؤں میں بچھوے نہ تھے لیکن جس وقت وہ چلتی تھی۔ تو میں عالم خواب میں اُن کی آواز سنتا تھا۔

اسطرح سے دس سال گزر گئے۔ اور گاؤں والوں میں سے کسی نے بھی وقت کے گزر جانے کو محسوس نہ کیا۔ اس سال ستمبر کے آخر میں آج کا سا ایک دن آیا۔ تمہاری دادیوں نے حسب معمول خوشنما دھوپ کو دیکھا جیسا کہ تم آج دیکھ رہے ہو۔ وہ گاؤں کی پر فضا گلیوں سے کلسے بغل میں دبائے باتیں کرتی پانی بھرنے آئیں۔ اس وقت تمہارے دنیا میں آنے کا انہیں خیال تک نہ تھا۔ آج کے دن تم پورے طور پر اس بات کو ہرگز دھیان میں نہیں لا سکتے۔

کہ تمہاری دادیاں جبکہ وہ چھوٹی لڑکیاں تھیں۔ کسی زمانے میں اِدھر اُدھر دریا کے کنارے دوڑا کرتی تھیں۔ اور وہ دن ایسا ہی اصلی اور حقیقی تھا جیسا کہ آج کا دن ہے۔ اور وہ بھی تمہاری طرح اپنے چھوٹے چھوٹے نازک دلوں میں رنج و خوشی محسوس کیا کرتی تھیں۔ ان کے لئے یہ بات ناممکن سی تھی۔ کہ دھوپ سے منور موسمِ خزاں کا دن ایک ایسا بھی آئے گا جبکہ انکی ہستیاں مٹ چکی ہونگی۔ اور جبکہ اُن کے رنج و راحت کا ہر ایک نشان گم ہو چکا ہوگا۔

(۴)

اُس روز طلوع آفتاب کے وقت سے ہی اُتر کی ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اور کبھی کبھی پیپل کے چند پتّے میری سبز چھپول پر آ گرتے تھے۔ رات کے شبنم کے نشان کہیں کہیں میرے سنگین جسم پر موجود تھے اُس صبح کو ایک بلند و بالا خوبصورت گورے رنگ کے سنیاسی نے میرے سامنے شوجی کے مندر میں آکر قیام کیا۔ یہ معلوم نہیں۔ کہ وہ کہاں سے آیا تھا۔ گاؤں میں اُسکے آنے کی دھوم مچ گئی۔ عورتوں نے اپنے کلسے رکھ دیئے۔ اور سادھو کو نمسکار کرنیکے لئے مندر میں جمع ہو گئیں۔ ہر روز خلقت کا ہجوم سادھو کے درشنوں کے لئے بڑھتا جاتا تھا۔ وہ سنیاسی بے حد خوبصورت جوان تھا۔ وہ خوش خلق بھی تھا۔ وہ بچّوں کو گود میں اُٹھا لیتا۔ اور عورتوں سے اُنکے گھر کے حالات دریافت کرتا۔ کچھ عرصے میں تمام عورتیں اُسکی معتقد ہو گئیں۔ بہت

سے مرد بھی اُسکے پاس آتے تھے۔ کسی روز وہ بھاگوت کی کتھا کرتا کبھی روز گیتا کی اور کسی دن اور کسی شاستر کی کتھا سُناتا بعض اُس سے اپنی مشکلات میں مشورہ لیتے۔ بعض کسی کتاب کا سبق اور دوا دارو لے جاتے اُسکی صورت پر ایسا جلال تھا۔ گویا مہادیو انسان کی صورت اختیار کرکے خود اپنے مندر میں اُتر آئے ہیں۔ جب پَو پھٹنے سے پہلے سنیاسی چھاتی تک پانی میں کھڑا ہوکر اور صبح کے ستارے کی طرف نظر جماکر سُریلی آواز میں وید منتر پڑھتا۔ تو پانی کے شور و غل کی طرف سے میں اپنا دھیان ہٹا لیتا۔ جب گنگا کے مشرقی کنارے کے اوپر آسمان پر شفق نمودار ہوتی۔ اور بادلوں کے کناروں پر سُرخ سنجاف لگاتی۔ تو رات کی تاریکی غنچہ کی چٹک کی طرح دور ہوتی۔ اور صبح ایک پھول کی طرح اپنی سُرخ جھلک آہستہ آہستہ آسمان کی جھیل میں دکھلاتی ہوئی آتی۔ پھر درختوں کی چوٹیاں اُفق پر صاف نظر آنے لگتیں ہوا بیدار ہوتی۔ آسمان کی رنگت خاکی ہونے لگتی۔ اور آخر میں ایک نامعلوم علاقے سے درختوں کی اوٹ میں صبح کا اشنان کرکے پوتر سورج قدم بقدم آسمان پر چڑھنا شروع کرتا۔ میرا خیال یہ تھا کہ چونکہ وہ سہائی پش پانی میں کھڑا ہوکر مشرق کی طرف منہ کرکے پُر تاثیر منتر پڑھتا تھا۔ اُسکے ہر ایک لفظ سے رات کا پردہ پھٹتا جاتا تھا۔ چاند اور ستارے مغرب میں ڈوب جاتے۔ اور سورج مشرق میں نمودار ہوکر دُنیا کا نقشہ بدل دیتا تھا۔ یہ

سنیاسی کیسا کراماتی تھا۔ اشنان کر کے جب وہ دریا سے نکلتا۔ تو بگ کی آگ کے شعلے کی طرح اس کا سندر اور مقدس جسم چمکتا۔ اسکے بالوں کی لٹوں سے پانی کے قطرے ٹپکتے تھے۔ اور نئے سورج کی روشنی اُسکے جسم سے ٹکرا کر واپس آتی تھی۔

کئی مہینے گذر گئے۔ اپریل کے مہینے میں سورج گرہن پر بہت سے جاتری گنگا میں اشنان کرنے آئے۔ اور پیپل کے درخت کے نیچے میلہ لگا۔ بہت سے یاتری سنیاسی کو دیکھنے آئے۔ اُنمیں اُس گاؤں کی کچھ عورتیں تھیں۔ جہاں کسم بیاہی گئی تھی۔ صبح کے وقت سنیاسی مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھا جپ کر رہا تھا۔ کہ دفعتاً ایک جاتری عورت نے ایک دوسری عورت نے ایک دوسری عورت سے کہا۔ "دیکھو تو کیا یہ ہماری کسم کا شوہر ہے؟" دوسری نے اپنا گھونگھٹ ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ اور کہا۔ "بیشک وہی ہے۔" تیسری نے کہا۔ "دیکھو تو اسکی آنکھیں ناک اور بھویں بالکل ویسی ہی ہیں۔" لیکن ایک اور عورت نے سنیاسی کو دیکھے بغیر ہی اپنا کلسہ پانی میں بھرتے ہوئے کہا۔ "وہ بیچارہ تو کبھی کا مر چکا۔ اب وہ دنیا میں نہیں آئے گا۔ بیچاری کسم کی قسمت۔"

ایک اور عورت نے کہا۔ "اُسکے اتنی بڑی داڑھی نہ تھی۔"

دوسری نے کہا۔ "وہ ایسا دُبلا نہ تھا۔ اور اتنا بلند قد۔"

اِس قدر بات چیت کے بعد معاملہ ختم ہو گیا۔ گاؤں کے سب آدمیوں
نے سنیاسی کو دیکھا تھا۔ مگر کسم کو کبھی اُسکے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔
کیونکہ اُس نے دریا پر ایسے وقت میں جبکہ آدمیوں کا ہجوم بہت ہو۔ آنا بند کر دیا تھا۔
ایک روز پورنماشی کی شام کو وہ گھاٹ پر آئی۔ اس وقت گھاٹ پر
کوئی نہ تھا۔ چمگادڑیں اِدھر اُدھر گشت لگا رہی تھیں۔ مندر میں گھنٹے اور
گھڑیال ابھی ابھی ختم ہوئے تھے۔ گھڑیال کی آخری آواز کی گونج ہلکی ہوتے
ہوتے سائے کی طرح دوسرے ساحل کے گھنے جھنڈوں میں جا کر گم ہو گئی
تھی۔ آسمان پر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ کسم اپنا سایہ مجھ پر ڈالے ہوئے بیٹھی تھی
ہوا بالکل بند تھی۔ درخت ذرا نہ ہلتے تھے۔ اُس کے سامنے گنگا کی چادر پر چاندنی
بچھی ہوئی تھی۔ اسکے پیچھے اِدھر اُدھر جھاڑیوں اور جھنڈوں میں مندر کے
سایہ میں۔ کھنڈروں کے دامن میں اور تالاب کے پہلو میں تاریکی اپنا منہ
چھپاتی پھرتی تھی۔ مندر کی چھت پر اُلو غمگین چیخیں مار رہا تھا۔ مکانات کے
قریب گیدڑوں کی لکار کبھی کبھی سنائی دیتی اور سناٹے میں گم ہو جاتی تھی۔
سنیاسی آہستہ سے باہر نکلا۔ اور گھاٹ کی چند سیڑھیاں اُتر کر اُس
نے ایک عورت کو تنہا کھڑا پایا۔ وہ واپس جانے کو تھا۔ کہ دفعتاً کسم نے اپنا
سر اُٹھایا۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ساری اُس کے سر سے سرک گئی۔ اور جسطرح
چاندنی ایک تازہ کھلے ہوئے پھول پر چمکتی ہے۔ اسی طرح وہ اسکے منہ پر

درخشاں ہوئی۔ جس وقت اُس نے سر اُٹھایا۔ اُس وقت دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، گویا انہوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اور انہیں ایسا محسوس ہُوا۔ کہ شاید کسی پہلے جنم میں وہ ایک دوسرے سے واقف تھے۔ یہ میرا خیال تھا۔ ورنہ وہ دونوں ایک لمحے تک تصویر کی طرح خاموش کھڑے رہے۔ جس وقت چاندنی میں اُنکے سائے میری سطح پر ہم آغوش تھے۔ اُلّو بولتا ہُوا۔ اُنکے سر پر سے گزر گیا۔ اُس کی آواز سُن کر کُسم چونکی۔ اور ساری کا پلہ اپنے سر پر لیا۔ پھر اُس نے جھُک کر سنیاسی کے قدم لئے، سنیاسی نے اُس کو آشیرباد دے کر پوچھا" تو کون ہے؟"

اُس نے جواب دیا" میں کُسم ہوں"

اُس رات اس سے زیادہ اور کوئی کلام انکے درمیان نہیں ہُوا کُسم آہستگی سے اپنے گھر کو روانہ ہوئی۔ لیکن سنیاسی اُس رات گھنٹوں میری سیڑھیوں پر بیٹھا رہا۔ آخر جب چاند مشرق سے گردش کر کے مغرب کی طرف چلا گیا۔ اور سنیاسی کا سایہ اُس کے پیچھے سے سامنے کی طرف آنے لگا۔ تو وہ کھڑا ہُوا۔ اور مندر میں چلا گیا۔

(۵)

میں نے دیکھا۔ کہ دوسرے دن سے کُسم ہر روز آ کر سنیاسی کو پرنام کرتی اور جب وہ گیتا سُناتا۔ تو ایک گوشے میں کھڑی ہوئی سُنا کرتی تھی۔ سنیاسی

اپنے صبح کے نت نیم سے فارغ ہو کر کسم کو اپنے پاس بلاتا۔ اور اس سے مذہبی معاملات پر گفتگو کرتا۔ وہ ہندو فلسفے کے باریک مسائل کو بخوبی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ تاہم وہ بڑی توجہ سے خاموشی کے ساتھ سنتی تھی۔ سنیاسی جس جس طرح اس کو ہدایت کرتا۔ وہ اس کی حرف بحرف تعمیل کرتی۔ وہ ہر روز مندر تک کی پوجا کرتی۔ مندر کا فرش دھونے کو گنگا کا پانی بھر کر لاتی۔ اور پوجا کے لئے پھول توڑ کر لایا کرتی تھی۔ سنیاسی اسکو جو تعلیم دیتا۔ وہ میری سیڑھیوں پر بیٹھ کر اس پر غور کرتی۔ رفتہ رفتہ اسکی نظر وسیع ہو گئی۔ اور دل کے پٹ کھلتے گئے۔ اسکے دھیان میں وہ باتیں آنے لگیں۔ جو پہلے کبھی نہ گذری تھیں۔ وہ کچھ سننے لگی۔ جو پہلے کبھی اسکے کانوں نے نہیں سنا تھا۔ اس کے اداس چہرے سے ملال کی زنگت دور ہو گئی۔ وہ اس پھول کی طرح معصوم اور پاک معلوم ہونے لگی۔ جو صبح کے شبنم سے دھویا ہوا دیوتاؤں کی پوجا کے لئے لایا جاتا ہے۔ اور جب وہ صبح کے وقت دلی اعتقاد کے ساتھ سنیاسی کے قدموں پر جھکتی۔ تو وہ اس پھول کی مانند معلوم ہوتی تھی۔ جو ہون کنڈ پر چڑھایا گیا ہو۔ پاکیزہ خوشی نے اسکے سارے جسم کو منور کر رکھا تھا۔

جاڑے کا موسم ختم ہونے کو تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ چلتے تھے لیکن کبھی کبھی خلاف توقع جنوب کی طرف سے موسم بہار کی گرم ہوا کا جھونکا

بھی آ جاتا تھا۔ شام کے وقت آسمان پر سردی کی سی رنگت باقی نہ رہی تھی
بہت عرصے کے بعد گاؤں سے بانسری اور دوسرے باجوں کی آوازیں
آنے لگی تھیں۔ ملاح اپنی کشتیاں بجائے رسّوں سے کھینچنے کے دھار پر
چلانے اور سری کرشن بھگوان کے حمد کے بھجن گانے۔ پرندوں نے بڑی خوشی
کے ساتھ درختوں پر چہچہانا شروع کر دیا۔ ان دنوں اس قسم کا موسم تھا کہ
موسم بہار کی ہوا نے میرے سنگیں دل میں نئی جوانی بھر دی تھی۔ پودوں میں
نئے نئے شگوفے پھوٹنے شروع ہو گئے تھے۔ مگر ایسے زمانے میں کسم نے گنگا
پر آنا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ مجھے معلوم نہیں ہو سکا لیکن کچھ عرصے
بعد ایک شام کو وہ دونوں میری سیڑھیوں پر ملے کسم نے نیچی نظر کئے ہوئے سوال کیا۔

"مہاراج! کیا آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

سنیاسی نے جواب دیا "ہاں! کیا وجہ ہے۔ کہ اب تم نے آنا چھوڑ دیا
ہے؟۔ اب تم نے پوجا کرنی کیوں ترک کر دی؟"

کسم خاموش رہی۔

سنیاسی نے کہا "تم اپنے دل کا سارا حال مجھے سناؤ"

کسم نے منھ پھیر کر کہا: "مہاراج میں پاپن ہو گئی ہوں۔ اس لئے
پوجا کرنی چھوڑ دی۔

سنیاسی نے بڑی مہربانی کے لہجے میں کہا "کسم میں جانتا ہوں۔

تمہارے دل میں بے اطمینانی ہے۔"

کسم ذرا جھجکی۔ اُسے اندیشہ ہُوا۔ کہ شاید وہ سب کچھ جانتا ہے۔ رفتہ رفتہ اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ وہ ساری کا پلّہ مُنھ پر ڈال کر سنیاسی کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی۔ اور رونے لگی۔ سنیاسی دو ایک قدم ہٹ گیا۔ اور اُس نے کہا:۔ اپنی سرگزشت مجھے سناؤ۔ میں تمہیں اطمینان کی راہ بتاؤں گا۔"

یہ اُس نے ایسے لہجے میں کہا جسکے ایک ایک لفظ سے سچائی ٹپکتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اُس کی زبان رُک جاتی تھی۔ کسم نے جواب دیا۔ اگر آپ حکم دیتے ہیں۔ تو میں سب حال عرض کردوں گی۔ لیکن میں صاف صاف نہیں کہہ سکتی۔ غالباً آپ نے خود ہی قیاس کر لیا ہوگا۔ کہ اصلی معاملہ کیا ہے۔ میں نے ایک شخص کو ایشور سمجھا۔ اور اسکی پرستش کی۔ اور اسکی بھگتی کا جذبہ میرے رونئیں رونئیں میں بس گیا۔ لیکن ایک رات میں نے خواب میں دیکھا۔ کہ میرے دل کے مالک نے میرا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ سے پکڑ رکھا ہے۔ اور پیار اور محبت کی باتیں کرتا ہے۔ اُس وقت یہ تمام نظارہ مجھے ناممکن محسوس نہ ہُوا۔ خواب گزر گیا۔ لیکن اسکا اثر دل میں ہمیشہ کیلئے باقی رہ گیا۔ دوسرے روز جب میں نے اس کو دیکھا۔ تو وہ پہلے کی نسبت دوسرے رنگ میں نظر آیا۔ خواب کی وہ تصویر میرے دل پر قابض ہوگئی۔ میں خوفزدہ

ہو کر اُس سے دُور رہنے لگی۔ لیکن اسکے تصوّر نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ اِس وقت سے میرے دل کو چین نہیں ہے۔ اور میرے اندر بالکل اندھیرا چھا گیا ہے۔"

(۶)

جبکہ وہ آنسو پونچھتی ہوئی اپنی کہانی سُنا رہی تھی۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ سنیاسی اپنے دائیں پاؤں سے میری سطح کو زور کے ساتھ دبا رہا تھا۔ سنیاسی نے کہا "تمہیں بتانا چاہیئے۔ کہ تم نے کِس شخص کو خواب میں دیا ہے؟"

کسم نے ہاتھ جوڑ کر کہا:۔ "یہ میں نہیں بتا سکتی۔"

سنیاسی نے کہا:۔ "میں تمہاری بہتری کے لئے پوچھتا ہوں۔ سچ سچ بتاؤ۔ وہ کون ہے؟"

کسم نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے "لیکن بدستور جوڑے ہوئے کہا۔ "مجھے ضرور بتانا ہوگا؟"

سنیاسی نے کہا۔ "ہاں ضرور!"

وہ فوراً چلا اُٹھی "مہاراج وہ شخص آپ ہی ہیں۔"

جب وہ یہ الفاظ کہہ چکی۔ تو ایک دم بیہوش ہو کر سبز جھیل پر گر پڑی۔ لیکن سنیاسی ایک پتھر کی مورت کی طرح اُسی جگہ کھڑا رہا۔

جب اُس کو ہوش آیا۔ اور اُٹھکر بیٹھ گئی۔ تو سنیاسی نے آہستہ سے کہا وہ کسم تم نے اب تک میری ہر ایک ہدایت کی تعمیل کی ہے میں ایک اور حکم دیتا ہوں۔ اس کی بھی تمہیں تعمیل کرنی ہوگی۔ میں آج کی رات یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تم مجھے پھر نہ دیکھوگی۔ اس لئے میں کہتا ہوں۔ تم مجھے بالکل بھول جاؤ۔ وعدہ کرو۔ کہ تم ایسا ضرور کروگی"

کسم سیدھی کھڑی ہوگئی۔ سنیاسی کے مُنہ کی طرف دیکھا۔ اور نرم آواز میں جواب دیا "مہاراج! جیسا آپ فرماتے ہیں۔ ایسا ہی ہوگا"

سنیاسی نے کہا: "بس اب میں جاتا ہوں"

ایک لفظ زبان سے نکالے بغیر کسم آگے جھُکی۔ اور سنیاسی کے پاؤں کی خاک لیکر اپنے سر پر ڈالی۔ سنیاسی وہاں سے چلا گیا۔

کسم نے اپنے دل میں کہا۔ اس کا حکم یہ ہے۔ کہ میں اُسے بھول جاؤں۔

اس کے بعد آہستہ آہستہ وہ دریا کی طرف گئی۔ جب سے وہ بہت چھوٹی لڑکی تھی۔ وہ اسی دریا کے کنارے رہی تھی۔ اگر مشکل کے وقت میں دریا اُسے گود میں لینے کے لئے ہاتھ نہ پھیلاتا۔ تو دوسرا کون اس کی مدد کرتا ہے۔

چاند چھپ گیا۔ رات تاریک ہوگئی۔

ایسی تاریکی میں پانی سے فریاد کی طرح کسی کے کودنے کی آواز آئی۔ ہوا اس قدر تیز چل رہی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ ستاروں کے چراغ آسمان پر گل ہو جائیں گے۔ کوئی اس دل ہلا دینے والے واقعہ کو نہیں دیکھ سکے گا۔ مگر بقول شخصے۔ ؎

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

وہ کسم جو برسوں میری گود میں بیٹھی تھی۔ میرے دامن پر کھیلی تھی۔ آج اس کا آخری کھیل بھی میری سمجھ میں آگیا۔ کہ وہ میری گود خالی کر کے چلی۔ لیکن کہاں گئی؟۔ اس کا حال خدا کو معلوم ہے۔
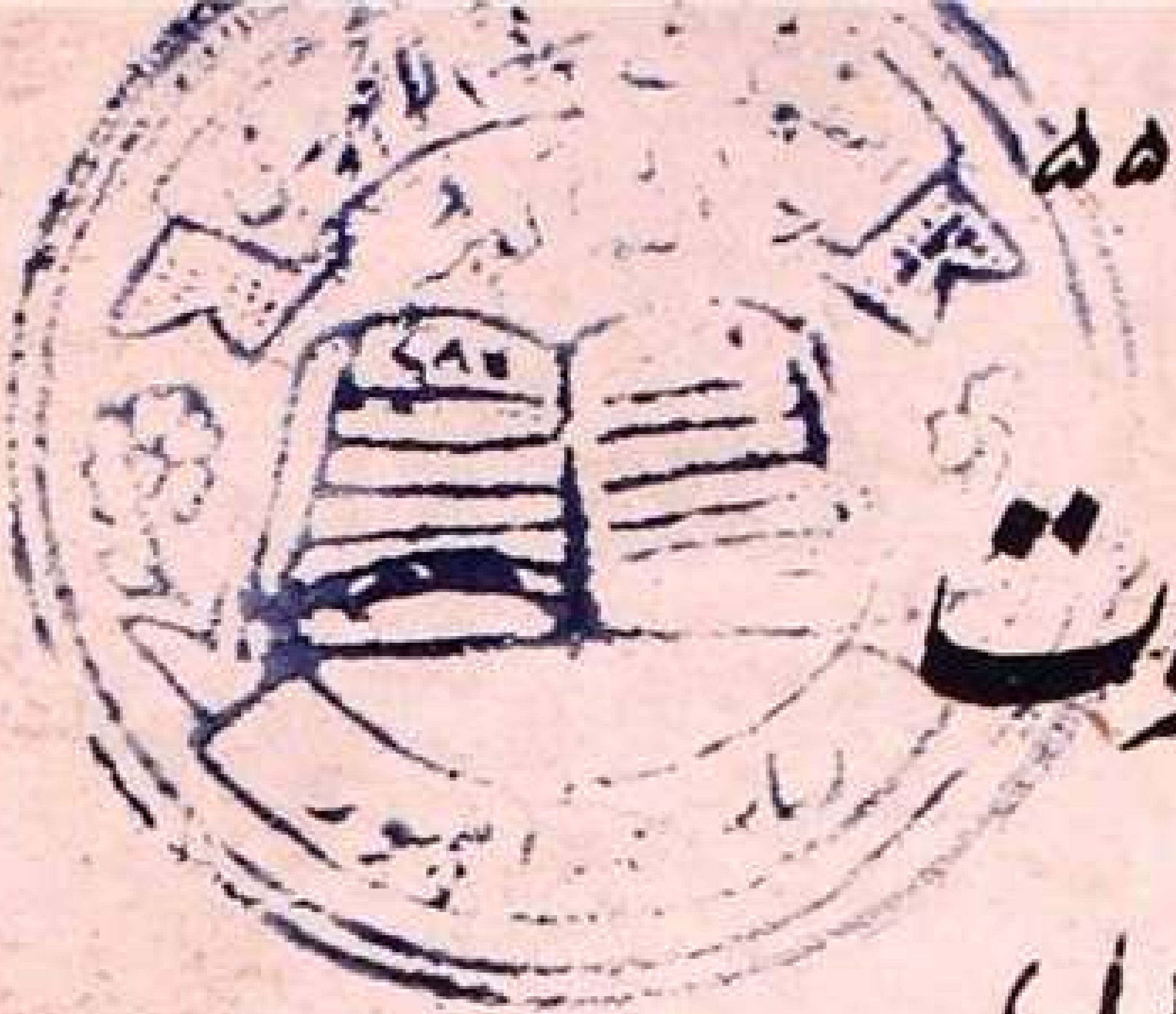
زندگی اور موت

(۱)

معمولی کتابیں پڑھانے کے بعد میرے باپ نے مجھے طب کی تعلیم دلانے کی کوشش کی۔ اور ایک ایسے وید کو میرا استاد مقرر کیا۔ جو ڈاکٹری سے بھی واقف تھا۔ میرے اُستاد نے جسم کی ساخت کے متعلق باتیں سمجھانے کے لئے ایک انسانی ہڈیوں کا پنجر کبھی میرے کمرے میں رکھ دیا تھا۔ میں چونکہ بچہ تھا۔ اس لئے اس ڈھانچہ کو دیکھ کر مجھے خوف معلوم ہوتا تھا۔ اور میں اس کے پاس اکیلا جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ مگر میرا ساتھی جو میرے ساتھ ہی تعلیم پاتا تھا۔ بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ اس کو یقین تھا۔ کہ بے جان ہڈیاں کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ اس لئے ان سے ڈرنا جھجکنا بیوقوفی ہے۔ میرا خیال اس سے مختلف تھا۔ میں ان کے وجود کے ساتھ ان کے احساس اور افعال کو مانتا تھا۔ اگرچہ مجھے دوسروں سے اس کی امید نہ تھی کہ وہ میرے خیال کی تائید کریں گے۔ لیکن میرا خیال غلط نہیں تھا اور آخر کو صحیح ثابت ہوا۔

(۲)

کچھ دن گزرے۔ کہ ایک رات خانگی ضروریات کی وجہ سے مجھے اس کمرے میں سونا پڑا۔ چونکہ میرے لئے یہ نئی جگہ تھی۔ اس لئے نیند نہ آئی۔ اور میں بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ یہانتک پاس کے گرجا نے گیارہ بجا دیئے۔ لیمپ جو میرے کمرہ میں روشن تھا۔ مدھم ہونا شروع ہوا۔ اور پھر آہستہ آہستہ گل ہو گیا۔ اس وقت مجھے اس روشنی کی نسبت خیال آیا۔ کہ ایک لحظہ پیشتر وہ روشنی تھی۔ مگر اب ہمیشہ کے لئے تاریکی میں بدل گئی ہے۔ دُنیا میں انسانی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ جو کبھی رات کو کبھی دن کو ابدی زندگی میں جا ملتی ہے۔

رفتہ رفتہ میرا خیال ہڈیوں کے ڈھانچے کی طرف منتقل ہونا شروع ہوا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا۔ کہ خدا جانے یہ ہڈیاں اپنی زندگی میں کیا کچھ نہ ہوں گی۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا۔ گویا کوئی متحرک چیز میرے پلنگ کے اِدھر اُدھر تاریکی میں پھر رہی ہے۔ پھر لمبی سانسوں کی آواز جیسے کوئی غمزدہ شخص سانس لیتا ہے۔ میرے کانوں میں پڑی اور پیروں کی آہٹ بھی آئی۔ میں نے خیال کیا۔ یہ میرا وہم ہے اور بدخوابی کی وجہ سے خیالی آوازیں آ رہی ہیں۔ مگر پاؤں کی آواز پھر آئی۔ اس پر میں نے رفع شک کی خاطر زور سے کہا۔ "کون ہے؟"

یہ سن کر وہ نامعلوم شکل میرے پلنگ کے نزدیک آ ئی اور بولی:۔
"میں ہوں" اپنی ہڈیوں کو دیکھنے آئی ہوں۔"
"میں نے خیال کیا۔ میرا کوئی واقف مجھ سے ہنسی کر رہا ہے۔ اِس لئے کہا" یہ کونسا موقعہ ہڈیوں کے دیکھنے کا ہے۔ اصل مدعا کہو؟"
آواز آئی:۔" مجھے وقت بے وقت سے کیا غرض۔ میری چیز ہے میں جس وقت چاہوں۔ اسے دیکھ سکتی ہوں۔ آہ! کیا تم نہیں دیکھتے۔ وہ میری پسلیاں ہیں۔ جن میں مدتوں دل رہا ہے۔ میں پورے ۲۶ سال اس آشیانے میں مقیم رہی ہوں۔ جس کو اب تم ہڈیوں کا ڈھانچہ کہتے ہو۔ اگر میں اپنے پرانے گھر کو دیکھنے چلی آئی۔ تو اس میں تمہارا کیا ہرج ہوا؟"
میں ڈر گیا۔ اور روح کو ٹالنے کے لئے کہا" تم جا کر اپنی ہڈیاں دیکھ لو۔ مجھے نیند آتی ہے۔ میں سوتا ہوں۔"
میں نے دل میں ارادہ کر لیا۔ کہ جس وقت وہ یہاں سے ہٹی فوراً بھاگ کر باہر چلا جاؤں گا۔ لیکن وہ ٹلنے والی آسامی نہ تھی۔ اور کہنے لگی" کیا تم یہاں تنہا سوتے ہو؟۔ اچھا آؤ کچھ باتیں کریں۔"
اس کا اصرار میرے لئے آفت ناگہانی سے کم نہ تھا۔ موت کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ مگر چار و ناچار جواب دیا۔

اچھا، بیٹھ جاؤ۔ اور کوئی مزیدار بات سناؤ۔"

آواز آئی "لو سنو! ۲۵ سال گزرے ہیں۔ کہ میں بھی تمہاری طرح انسان تھی۔ اور انسانوں میں بیٹھکر گفتگو کیا کرتی تھی لیکن اب مرگھٹ کے ویرانے میں پھرتی رہتی ہوں۔ آج میری خواہش ہے۔ کہ میں پھر اس قدر عرصہ دراز کے بعد انسانوں سے باتیں کروں۔ میں خوش ہوں۔ کہ تم نے بھی میری باتیں سننے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ کیوں تم باتیں سننا چاہتے ہو یا نہیں ؟"

یہ کہہ کر وہ اور آگے کی طرف آئی۔ اور مجھے معلوم ہوا۔ کہ کوئی شخص میری پائینتی پر بیٹھ گیا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ میں کوئی لفظ زبان سے نکالوں۔ اُس نے اپنا قصہ سنانا شروع کر دیا۔

اب کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے پھر حوصلہ کر کے کہا :۔ "اچھا کوئی عمدہ کہانی سناؤ ؟"

(۳)

وہ بولی :۔ اے صاحب جب میں انسانی جامہ میں تھی۔ تو صرف ایک شخص سے ڈرا کرتی تھی۔ اور وہ شخص میرے حق میں گویا موت کا فرشتہ تھا۔ وہ میرا خاوند تھا۔ جسطرح ایک شخص مچھلی کو کُنڈی لگا کر پانی سے باہر نکال لایا ہو۔ یہ شخص مجھ کو میرے والدین کے گھر سے

لے آیا تھا۔ اور وہاں مجھ کو جانے نہیں دیتا تھا۔ شکر ہے کہ اس کا کام
جلد تر ہو گیا۔ یعنی شادی کے دوسرے مہینے ہی وُہ دنیا سے چل بسا۔
مَیں نے لوگوں کے دیکھا دیکھی نالہ و شیون کیا۔ لیکن دل میں بہت
خوش تھی۔ کہ کانٹا نکل گیا۔ اب مجھ کو اپنے والدین سے ملنے کی اجازت
مل جائیگی۔ اور مَیں اپنی پُرانی سہیلیوں سے جن کے ساتھ مَیں کھیلا کرتی
تھی۔ ملوں گی۔ لیکن ابھی مجھ کو میکے جانے کی اجازت نہ ہوئی تھی۔ کہ
ایک دن میرا خسر گھر میں آیا۔ اور میرا چہرہ غور سے دیکھ کر اپنی اہلیہ سے
کہنے لگا۔ مجھ کو قیافے سے یہ لڑکی ڈائن معلوم ہوتی ہے۔" اپنے خسر کے
الفاظ اب تک مجھ کو یاد ہیں۔ اور میرے کانوں میں گونج رہے ہیں
اس کے چند دن بعد مجھ کو اپنے باپ کے گھر چلے جانے کی اجازت مل
گئی۔ باپ کے گھر پہنچ جانے پر مجھ کو جو خوشی حاصل ہوئی۔ وہ احاطۂ
بیان سے باہر ہے۔ مَیں وہاں ہنسی خوشی رہنے اور اپنی جوانی کے
دن گزارنے لگی۔ مَیں نے ان دنوں بارہا اپنی نسبت لوگوں سے سُنا۔
کہ مَیں خوبصورت نازنین ہوں۔ مگر تم کہو۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

مَیں نے کہا۔ "مَیں نے تمہیں زندگی کی حالت میں دیکھا نہیں مَیں
کیسے رائے دے سکتا ہوں۔ جو کچھ تم نے کہا درست ہوگا۔"

وہ بولی "مَیں کس طرح یقین دلاؤں۔ کہ ان دو خانوں میں دو

سرمگیں آنکھیں دیکھنے والوں پر بجلیاں گراتی تھیں! افسوس تم میرے اصلی تبسم کا اندازہ ان ہڈیوں کے کھلے منہ سے نہیں لگا سکتے۔ ان ہڈیوں کے گرد خوبصورتی تھی۔ اب اس کا نام تک نہیں ہے۔ میری زندگی کے ایام میں کوئی لائق سے لائق ڈاکٹر بھی گمان نہ کر سکتا تھا۔ کہ میری ہڈیاں تشریح جسم انسانی کے کام آئیں گی۔ مجھے وہ دن یاد ہیں۔ جب میں چلا کرتی تھی۔ تو نور کی شعاعیں میرے بال بال سے نکل کر ہر سمت کو منور کیا کرتی تھیں۔ میں اپنے بازوؤں کو گھنٹوں دیکھا کرتی تھی۔ آہ! یہ وہ بازو تھے۔ کہ جس کو میں نے دکھائے اپنا فریفتہ کر لیا۔ شاید سبھدرا کو بھی ایسے گول اور سڈول بازو نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔ میری چھوٹی نازک انگلیاں پنجہ مرجان کو شرماتی تھیں۔ افسوس! میرے اس برہنہ ڈھانچے نے تمہیں میرے حسن و جمال کی نسبت بالکل غلط رائے قائم کرنے کا موقعہ دیا۔ تم مجھ کو ایام شباب میں دیکھتے۔ تو آنکھوں سے نیند اڑ جاتی۔ اور علم تشریح کا سودا دماغ سے حرف غلط کی طرح محو ہو جاتا۔"

میں نے جواب دیا "یقین جانو۔ تمہاری اس گفتگو سے بھی طب کے سارے معلومات میرے دماغ سے خارج ہو گئے ہیں۔ اور تمہاری دلکش خوبصورتی میرے دل میں نقش ہو گئی ہے۔ اچھا آگے کہو۔"

اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھ کر کہا۔ میرے بھائی نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ شادی نہ کروں گا۔ اس لئے گھر میں صرف میں ہی ایک عورت تھی۔ میں شام کو اپنے باغ میں سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھتی۔ تو ستارے مجھ کو گھورا کرتے تھے۔ ٹھنڈی ہوا جب میرے پاس سے گزرتی۔ تو میرے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی تھی۔ میں اپنے حسن کے غرور میں بارہا سوچا کرتی تھی۔ کہ جس زمین پر میرا قدم پڑتا ہے۔ اگر اس میں محسوس کرنے کی قوت ہوتی۔ تو خوشی سے پھولی نہ سماتی کبھی کہتی کہ دنیا کے سارے عاشق مزاج نوجوان گھاس کے تنکوں میں میرے قدموں پر غلطاں پڑے ہیں۔ اب یہ تمام خیالات بارہا مجھ کو پریشان کرتے ہیں۔ کہ آہ! کیا تھا۔ اور کیا ہو گیا۔ میرے بھائی کا ایک دوست سنتیش کمار تھا۔ جس نے میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی سند حاصل کی تھی۔ وہ ہمارا بھی خانگی ڈاکٹر تھا۔ گو اس نے مجھ کو نہیں دیکھا۔ مگر میں نے ایک روز اس کو دیکھ لیا۔ اور مجھے یہ کہتے ہیں تامل نہیں کہ اسکی خوبصورتی نے مجھ پر خاص اثر کیا۔ میرا بھائی عجیب قسم کا شخص تھا۔ وہ زمانے کے سرد گرم سے بالکل ناآشنا تھا۔ اور کبھی گھر کے کاموں میں دخل نہ دیتا تھا۔ وہ زیادہ تر خاموشی پسند تھا۔ اور تنہائی میں رہتا تھا۔ جس کا انجام یہ ہوا۔ کہ وہ دنیا

سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین بن گیا۔ اور عارفانہ زندگی بسر کرنے لگا ہاں تو وہ نوجوان ستیش کمار اکثر ہمارے گھر آتا تھا۔ اور یہی ایک جوان تھا۔ جس کو اپنے گھر کے مردوں کے سوا مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا جب میں باغ میں تنہا ہوتی۔ اور پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کے نیچے ملکہ کی طرح بیٹھتی تو ستیش کمار کا خیال اور بھی میرے دل میں چٹکیاں لیتا۔ لیکن تم کس فکر میں ہو؟ تمہارے دل میں کیا خیال گزر رہا ہے؟

میں نے آہ سرد بھر کر جواب دیا " میں یہ خیال کر رہا ہوں۔ کہ کاش میں ہی ستیش کمار ہوتا"

وہ ہنس کر بولی: " اچھا پہلے میری کہانی سن لو۔ پھر عشق بازی کر لینا۔ ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ مجھے قدرے بخار تھا۔ کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بالمقابل دیکھا۔ اور دیکھتے ہی ڈاکٹر کو سکتہ سا ہو گیا۔ اگرچہ میرے بھائی کی موجودگی نے اس کو ہوش سنبھالنے پر مجبور کیا۔ وہ میری طرف اشارہ کر کے بولا " میں اُن کی نبض دیکھنا چاہتا ہوں" میں نے آہستہ سے اپنا بازو دوشالے سے باہر نکالا۔ ڈاکٹر نے میری نبض پر ہاتھ رکھا۔ میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کہ کسی ڈاکٹر نے معمولی بخار کی تشخیص میں اس قدر تامل

کیا ہو۔ اسکی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ سخت جدّ و جہد کے بعد اُس نے میرے بخار کا اندازہ لگایا۔ لیکن میرا بخار دیکھتے دیکھتے ہی بذاتِ خود بیمار ہو گیا۔ کیوں تم اس بات کو مانتے ہو یا نہیں "

مَیں نے ڈرتے ڈرتے کہا: "ہاں بالکل مانتا ہوں۔ آدمی کی حالت میں تغیّر پیدا ہونا کیا مشکل ہے "

وہ بولی! "چند روز امتحان کرنے سے معلوم ہوا۔ کہ میرے دلمیں ڈاکٹر کے سِوا اور کسی نوجوان کا خیال تک نہیں۔ میرا معمول تھا۔ کہ شام کے وقت بسنتی رنگ کی ساری پہن کر اپنے بالوں میں کنگھی کرکے پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر شیشہ ہاتھ میں لے باغ میں چلی جاتی۔ اور پہروں دیکھا کرتی۔ کیا شیشہ دیکھنا معیوب ہے ؟"

" مَیں نے گھبرا کر جواب دیا " نہیں تو "

اس نے سِلسلہ حکایت کو جاری رکھ کر کہا: "شیشہ دیکھ کر مَیں محسوس کرتی تھی۔ کہ گویا میری دو زندگیاں ہو گئی ہیں۔ یعنی مَیں خود ہی اپنے عکس کو معشوق سمجھ کر اس پر نقد دل نثار کیا کرتی۔ یہ میری مرغوب تفریح تھی۔ اور مَیں گھنٹوں اسی میں گزار دیا کرتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا۔ کہ دوپہر کو پلنگ پر بستر بچھا کر سو گئی۔ اور ایک بازو کو

بستر پر لاپروائی سے پھینک دیا۔ ذرا آنکھ جھپکی۔ تو خواب میں دیکھا کہ ستیش کمار آیا۔ اور میرے ہاتھ کو بوسہ دے کر چلا گیا۔ بس اب میں کہانی ختم کرتی ہوں۔ تمہیں تو نیند آرہی ہے"

میری دلچسپی بہت بڑھ چکی تھی۔ اس لئے میں نے منت کے لہجے میں کہا "نہیں تم کہے جاؤ۔ میرا شوق بڑھتا جا رہا ہے"

وہ کہنے لگی "اچھا تو سنو! تھوڑے دنوں میں ستیش کمار کا کاروبار بڑھ گیا۔ اور اس نے ہمارے مکان کے نچلے حصے میں اپنا مطب کھول لیا۔ جب اس کو مریضوں سے فرصت ہوتی۔ تو میں اس کے پاس جا بیٹھتی۔ اور ہنسی ٹھٹھے میں مختلف دواؤں کے نام پوچھتی رہتی اس طرح مجھے کئی ایسی دوائیں بھی معلوم ہو گئیں۔ جو زہر قاتل تھیں۔ ستیش کمار جو کچھ میں اس سے دریافت کرتی۔ بڑی محبت اور متانت سے بتایا کرتا۔ اسطرح ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ اور میں نے محسوس کرنا شروع کیا۔ کہ ڈاکٹر مفقود الحواس رہتا ہے۔ اور جب کبھی میں اس کے سامنے جاتی ہوں۔ تو اس کے چہرے پر مردنی چھا جاتی ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟۔ اس کی کچھ وجہ معلوم نہ ہوئی۔ ایک دن ڈاکٹر نے میرے بھائی سے گاڑی مانگی۔ میں پاس بیٹھی تھی میں نے بھائی سے پوچھا:۔ ڈاکٹر اس وقت رات کو کہاں جائے گا؟۔ میرے بھائی نے جواب دیا "تباہ

ہونے کو"۔ میں نے اصرار کیا۔ کہ مجھ کو ضرور بتاؤ۔ وہ کہاں جا رہا ہے ؟
بھائی نے کہا " وہ شادی کرنے جاتا ہے " یہ سُن کر مجھ پر ایک غشی سی
طاری ہو گئی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور بھائی سے پھر پوچھا
کیا سچ مچ وہ شادی کرنے جاتا ہے یا مذاق کرتے ہو ؟" اُس نے جواب
دیا۔ درست ہے۔ ڈاکٹر آج دُلہن لائے گا "

میں نہیں بتا سکتی۔ کہ مجھے یہ بات کس قدر شاق گذری۔ میں نے
اپنے دل سے بار بار پوچھا۔ کہ ڈاکٹر نے کیوں مجھ سے یہ بات پوشیدہ
رکھی ؟ کیا میں اس کو روکتی کہ شادی نہ کرے ؟۔ ان مردوں
کی بات کا کچھ اعتبار نہیں "

سہ پہر کو ڈاکٹر مریضوں کو دیکھ کر مطب میں آیا۔ اور میں نے
پوچھا " ڈاکٹر صاحب کیا یہ درست ہے۔ کہ آج آپ کی شادی
ہے ؟ یہ کہہ کر میں بہت ہنسی اور ڈاکٹر یہ دیکھ کر کہ میں اس کو ہنسی
کی ہنسی میں اُڑا رہی ہوں۔ نہ صرف شرمندہ ہوا۔ بلکہ کچھ متفکر سا
ہو گیا۔ پھر میں نے یکایک پوچھا " ڈاکٹر صاحب ! جب آپ کی
شادی ہو جائے گی۔ تو کیا آپ پھر بھی لوگوں کی نبض دیکھا کریں گے
آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ اور ڈاکٹروں کی نسبت مشہور ہے۔ وہ جسم کے
تمام اعضاء کا حال جانتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ آپ ڈاکٹر ہو

کہ کسی کے دل کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ کہ وہ کس حالت میں ہے۔ حالانکہ دل بھی جسم کا ایک حصّہ ہے"!

میرے الفاظ ڈاکٹر کے دل میں تیر کی طرح لگے۔ مگر وہ خاموش رہا۔

(۴)

لگن کی مہورت بڑی رات گئے مقرر ہوئی تھی۔ اور برات کو دیر سے جانا تھا۔ ڈاکٹر اور میرا بھائی حسب معمول شراب پینے بیٹھ گئے۔ اس شغل میں انکو بہت دیر ہو گئی۔

گیارہ بجنے کو تھے۔ کہ میں انکے پاس گئی۔ اور کہا "ڈاکٹر صاحب گیارہ بجنے والے ہیں۔ آپ کو شادی کے لئے تیار ہونا چاہیئے۔ وہ کسی قدر مسرور ہو گیا تھا۔ بولا "ابھی جاتا ہوں"۔ پھر وہ میرے بھائی کی باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اور میں نے موقعہ پاکر زہر کی پڑیا جو میں نے دوپہر کو ڈاکٹر کی غیر حاضری میں اُس کے صندوق سے نکالی تھی۔ شراب کے گلاس میں جو ڈاکٹر کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ڈال دی تھی۔ چند منٹ کے بعد ڈاکٹر نے اپنا گلاس ختم کیا۔ اور دولہا بننے کو چلا گیا۔ میرا بھائی بھی اسکے ہمراہ روانہ ہوا۔

میں بالائی کمرے میں گئی۔ اور اپنا نیا بناؤ سنگار کیا۔ دوپٹہ اوڑھا ماتھے پر سیندور لگایا۔ اور پوری سہاگن بن کر باغ میں نکلی۔ جہاں روز شام کو بیٹھا کرتی تھی۔ اس وقت چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ہوا میں خنکی تھی اور چنبیلی کی خوشبو نے باغ کو مہکا دیا تھا۔ اب میں نے پُڑیا کی باقی دوا نکالی۔ اور منہ میں ڈال کر جلدی جلدی پانی پی لیا۔ تھوڑی دیر میں میرے سر میں چکر سا آنے لگا۔ اور آنکھوں میں غنودگی چھا گئی چاند کی چاندنی مدھم ہونے لگی۔ اور زمین و آسمان۔ بیل بوٹے میرا گھر جہاں میں نے اس قدر عمر گزاری تھی۔ رفتہ رفتہ غائب ہوتے معلوم ہوئے۔ اور میں میٹھی نیند سو گئی۔

ڈیڑھ سال کے بعد نیند سے چونکی۔ اب جو دیکھا۔ تین لڑکے ہیں ایک اُستاد ہیں۔ جو لڑکوں کو سمجھا سمجھا کر کہہ رہے ہیں۔ "دیکھو! یہ جگہ دل کی ہے۔ جس کو تم ہاتھ رکھ کر اپنے پہلو دھڑکتے ہوئے دیکھ سکتے ہو یہ سینہ ہے۔ جو عورتوں کے جوان ہونے پر اُبھرتا ہے۔ اور جس پر شروع جوانی کے پھول ترقی کر کے شباب کے پھل اور ثمر حیات بن جاتے ہیں۔ جن کے رس سے بچے پرورش پاتے ہیں۔

اچھا اب تمہیں نیند آ رہی ہے۔ سو جاؤ۔ میری کہانی ختم ہو گئی۔"

آزمائش

شیاما کے ساتھ ایک ہی سکول میں کچھ دنوں میں نے تعلیم حاصل کی۔ اور "دُلہن دولہا" کا کھیل بھی کھیلا۔ میں شیاما کے گھر جاتا تھا۔ تو اُسکی ماں مجھے بڑے پیار سے بٹھاتی تھی ہم دونوں کو ایک ساتھ کھیلتے دیکھ کر شیاما کی ماں بہت خوش ہوتی تھی کبھی کبھی یہ بھی کہہ اُٹھتی تھی۔ کہ "کیا اچھی جوڑی ہے" میں اگرچہ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ لیکن شیاما کی ماں کی طبیعت کا اندازہ کر لیتا تھا۔ اس خیال نے میرے دل میں گھر کر لیا تھا۔ کہ دوسروں کی نسبت شیاما پر میرا خاص حق ہے۔ میں اس حق کے غرور میں کبھی کبھی شیاما پر اپنی حکومت بھی جتایا کرتا تھا۔ شیاما بھی صبر کے ساتھ میری زیادتیوں کو برداشت کرتی۔ اور میرے حکموں کو بجا لاتی تھی۔ محلے میں تمام لوگ شیاما کی خوبصورتی کی تعریف کرتے تھے۔ لیکن میں اُجڈ لڑکا تھا۔ میری نظر میں شیاما کے حسن کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ میں جانتا

تھا۔ کہ شیاما میری ہی حکومت قبول کرنے کے لئے اپنے باپ کے گھر پیدا ہوئی ہے۔ اور اسی وجہ سے خاص طور پر بے قدری کی مستحق ہے۔

میرے باپ زمیندار کے ہاں خزانچی تھے۔ ان کا ارادہ تھا۔ کہ میرا خط ٹھیک ہو جائے۔ تو مجھے اُس کے سررشتہ کا کام سکھا کر اُس کے گماشتوں میں نوکر رکھا دیں۔ لیکن میں دل ہی دل میں اُس کو ناپسند کرتا تھا۔ میرے پڑوس کا لڑکا کاشتا انگریزی پڑھ لکھ کر کلکٹر صاحب کا ناظر ہو گیا ہے۔ میرا نصب العین بھی ویسا ہی بلند تھا۔ میں نے اپنے دل میں طے کر رکھا تھا۔ کہ اگر کلکٹر صاحب کا ناظر نہ ہو سکا۔ تو جج کا ہیڈ کلرک ضرور ہو جاؤں گا میں ہمیشہ دیکھتا تھا۔ کہ میرے باپ عدالت کے ناظروں ہیڈ کلرکوں وغیرہ ہماری بڑی عزت کرتے تھے۔ بچپن ہی سے دیکھتا تھا۔ کہ ساگ، ترکاری، پھول، پھل، روپے پیسے وغیرہ سے ان کی خاطر کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ عدالت کے چپڑاسیوں کی بھی میرے دل میں ایک قدر تھی۔ یہ ہمارے ہندوستان کے مستحق پرستش دیوتا ہیں۔ ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کے چھوٹے چھوٹے ایڈیشن ہیں۔ مال کے مقدمات میں کار برآری گنیش دیوتا کی طرح سب سے پہلے

انہی کی پوجا ہوتی ہے۔

میں نے دیکھا۔ کہ کامتا کی طرح یہاں انگریزی پڑھنے کا موقع نہیں ہے۔ میں نے کامتا سے بڑھ کر کام کرنے کا ارادہ کیا۔ چھوٹے شہر سے ایک دم بڑے شہر میں بھاگ گیا۔ فتح پور سے الہ آباد پہنچا۔ پہلے اپنے شہر کے ایک طالب علم کی قیام گاہ پر ٹھہرا۔ گھر سے کچھ روپے لے گیا تھا۔ خرچ کی تنگی نہ تھی۔ اس کے بعد والد خرچ دینے لگے۔ غرض میں انگریزی پڑھنے لگا۔

جلسوں اور سوسائٹیوں میں بھی شرکت کرنے لگا۔ اس بات میں مجھے بالکل شبہ نہ تھا۔ کہ ملک کے لئے جان دینا ملک کے ہر باشندہ کا فرض ہے۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ کہ یہ اہم کام کس طرح انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ کہ کہنے کے سوا اس کو کوئی کر کے دکھاتا نہیں تھا۔ مگر اس کی وجہ سے جوش میں کوئی کمی نہ تھی۔ ہم چھوٹے شہر کے لڑکوں کی طرح ہر چیز پر ہنسنا نہیں سیکھا تھا۔ اسی سے ہماری طبیعت بہت مضبوط تھی۔ ہماری ملکی سبھا کے قابل لوگ لکچر دیتے تھے۔ ہم کھوکے پیاسے دوپہر کی دھوپ میں اشتہار تقسیم کرتے پھرتے تھے۔ جلسہ گاہ میں

کرسیاں، بنچیں بچھاتے پھرتے تھے۔ اور اگر کوئی ہمارے لیکچراروں کو کچھ کہتا۔ تو ہم لوگ کمرکس کر لڑنے کو تیار ہو جاتے تھے۔

ناظر یا ہیڈ کلرک ہونے کو آیا تھا۔ لیکن "میزنی" اور "گیری بالڈی" ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ اسی زمانے میں میرے والد شیاما کے باپ سے مشورہ کر کے میری شادی کا انتظام کرنے لگے۔ مَیں پندرہ برس کی عمر میں الہ آباد بھاگ آیا تھا۔ اُس زمانے میں شیاما آٹھ برس کی تھی۔ اُس وقت میں اٹھارہ برس کا تھا۔ والد کی سمجھ کے مطابق میری عمر گذری جاتی تھی۔ لیکن اس طرف میں یہ عہد کر چکا تھا۔ کہ مدت العمر شادی نہ کروں گا۔ اور ملک کو اپنی زندگی نذر کر دوں گا۔ مَیں نے والد سے کہہ دیا۔ کہ لکھنا پڑھنا تمام کیئے بغیر مَیں شادی نہ کروں گا۔ دو چار مہینے کے بعد مجھے خبر ملی کہ ایک وکیل کے ساتھ شیاما کی شادی ہو گئی۔ میں اس زمانے میں پبلک سیوا کے لئے چندہ وصول کرنے میں معروف تھا۔ یہ خبر بالکل معمولی معلوم ہوئی۔ انٹرنس پاس ہو گیا۔ ایف چھوڑ کر بنارس کے ایک ہائی اسکول میں سیکنڈ ماسٹر ہو گیا۔

مَیں نے اپنے دل میں کہا۔ کہ میرے لائق یہی کام ملا ہے۔ لیکچر

دے کر اور حوصلہ دلا کر ہر طالب علم کو ایسا بنا دوں گا۔ کہ جو لیڈر
بن کر ملکی سیوا کا بیڑا اٹھائے۔
کام شروع کر دیا۔ میں نے دیکھا۔ کہ لڑکوں کو امتحان
کے لئے تیار کرنا۔ ملک کی سیوا کرانے سے بھی زیادہ اہم کام
ہے۔ طلبا سے اگر "گرامر" اور "الجبرا" کے سوا کوئی بات کہو۔
تو ہیڈ ماسٹر خفا ہوتے ہیں۔ دو، تین مہینے میں ہی میرا بھی جوش
سرد پڑ گیا۔
میرے ہی ایسے نکمے آدمی گھر میں بیٹھ کر طرح طرح کی
خیال آرائیاں کرتے ہیں۔ لیکن میدانِ عمل میں اُتر لینے پر
کنارے پر ہل رکھے ہوئے بیل کی طرح پیچھے سے گھونسے ڈنڈے
برداشت کرتے ہیں۔ اور اس طرح ہمیشہ مٹی کے ڈھیلے توڑنے
کا کام کر کے شام کو انہیں جو آدھے پیٹ گھاس یا بھوسہ
ملتا ہے۔ اسی پر قانع رہتے ہیں۔ اُچھل کود کے لئے
جوش نہیں رہتا۔
میں "وشو میدھ" گھاٹ کے اوپر ہی ایک چھوٹے سے مکان
میں رہتا تھا۔ وہاں گنگا کا بیحد دل خوش کن منظر اور گھاٹ
کی صبح کا دل فریب سین دیکھنے کو ملتا تھا۔ اور گنگا اشنان کی

بھی سہولت تھی۔

ابھی تک میں نے ایک بات کا ذکر نہیں کیا۔ یہاں کے سرکاری وکیل پنڈت سندر لال میرے مکان کے پاس ہی رہتے تھے۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ کہ میری بچپن کی رفیق شیاما کے شوہر یہی ہیں۔ اور شیاما اسی گھر میں رہتی ہے۔ دو ایک بار میں نے اُسے گنگا نہانے جاتے دیکھا تھا۔

پنڈت سندر لال سے ایک روز دریا کے کنارے جان پہچان ہو گئی۔ اثنائے گفتگو میں یہ بھی بیان کیا۔ کہ فتح پور میں میرے ہی محلے میں اُن کی سسرال ہے۔ لیکن میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ شیاما لڑکپن میں میرے ساتھ کھیلی ہے۔ اور پہلے میرے ہی ساتھ اُس کی شادی ہونے والی تھی۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ میں شیاما کو ایک طرح سے بھول چکا تھا۔

ایک روز سکول میں تعطیل تھی۔ تنہا بیٹھے بیٹھے جی اُکتایا۔ میں اُٹھ کر وکیل صاحب کی بیٹھک میں گیا۔ باتوں باتوں میں ہندوستان کی خستہ حالی کا ذکر چھڑ گیا۔ وہ ہندوستان کی حالت پر زیادہ متفکر نہیں تھے۔ لیکن یہ موضوع ہی ایسا ہے۔ کہ ہر شخص اس کے متعلق گھنٹہ دو گھنٹہ خواہ مخواہ رو نا رو سکتا ہے۔ اور اپنی

وطن پرستی کا ثبوت دے سکتا ہے۔

اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ اسی اثنا میں نشست گاہ کے پیچھے کے دروازے کے پاس چوڑیوں کے بجنے کی آواز سنائی دی۔ مجھے صاف طور پر معلوم ہوا۔ کہ دو متعجب اور مضطرب آنکھیں مجھے کواڑوں کی درزوں سے دیکھ رہی ہیں۔ اس وقت مجھے وہ آنکھیں یاد آگئیں۔ کسی کی معصومیت، سادگی اور بچپن کی محبت سے معمور دو بڑی بڑی آنکھیں، کالی کالی پتلیاں، گھنی گھنی پلکیں۔ یہ خاموش نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا۔ گویا میرے دل کو کسی نے زور سے مٹھی میں دبا لیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور ایک طرح کا درد بھی محسوس ہونے لگا۔

گھر واپس آیا۔ لیکن دل کا درد بدستور موجود رہا۔ لکھنے پڑھنے اور لڑکوں کو تعلیم دینے میں بھی جی نہیں لگتا تھا۔ دل کی وہ حالت کسی طرح بدلتی نہیں تھی۔ طبیعت پر گویا کسی نے وزنی بوجھ رکھ دیا۔

شام کے وقت گھاٹ پر بیٹھ کر سوچنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایسا کیوں ہوا؟ دل کے اندر سے جواب ملا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تمہاری وہ شیاما کہاں گئی؟ میں نے جواب میں کہا.....

..... میں نے تو اپنی خوشی سے چھوڑ دیا ہے۔ کیا ہمیشہ وہ میرے لئے بیٹھی رہتی؟ دل کے اندر سے گویا کسی نے کہا.....

..... جسے اس وقت تم چاہتے تو آسانی سے عمر بھر کے لئے پا سکتے تھے۔ اس کو سر ٹیکنے پہ کبھی آج پوری نظر سے دیکھنے کا تم کو اختیار نہیں ہے۔ وہ تمہارے ساتھ کی بچپن کی کھیلی ہوئی شیاما خواہ کتنا ہی تمہارے قریب رہے۔ خواہ اس کی چوڑیوں کی آواز سنو، اور اپنی طرف اس کے دیکھنے کا گمان کرو لیکن تمہارے اور اس کے درمیان میں ایک زبردست فرق قائم ہی رہے گا۔

میں نے کہا .... ہرج کیا ہے؟ شیاما میری کون ہے؟

دل سے جواب ملا .... سچ ہے۔ آج شیاما تمہاری کون ہے۔ لیکن شیاما تمہاری ہی ہو سکتی تھی۔

یہ تو سچ ہے، شیاما میری ہی ہو سکتی تھی۔ لیکن آج وہ اتنی دور ہے۔ اتنی غیر ہے۔ کہ اسے دیکھنا برا ہے۔ اس کے ساتھ بات کرنی جرم ہے۔ اور اس کا خیال کرنا بھی گناہ ہے۔ اور

سندر لال جسے وہ جانتی بھی نہ تھی۔ نہ معلوم کہاں سے آکر اُس کا مالک بن گیا۔ صرف شادی کے دو چار منتروں کی بدولت دم بھر میں زندگی بھر کے لئے اُس نے شیاما پہ قبضہ کر لیا۔

میں انسانی سوسائٹی میں جدید رسم کو رائج کرنا نہیں چاہتا سوسائٹی یا اس کی قید توڑنا نہیں چاہتا۔ میں صرف اپنے دل کے سچے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں۔ دل میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا وہ سب درست اور جائز ہوتے ہیں۔ میں کسی طرح اپنے دل سے اس بات کو دور نہیں کر سکتا تھا۔ کہ سندر لال کے گھر میں . . . . دیوار کی آڑ میں جو شیاما رہتی ہے۔ وہ سندر لال سے کبھی بڑھ کر میری ہے۔ میں اس کو تسلیم کرتا ہوں۔ کہ ایسا سوچنا نہایت غیر موزوں اور غیر مناسب ہے۔ لیکن غیر فطری نہیں ہے۔

ان دنوں کسی کام میں میرا جی نہیں لگتا تھا۔ دوپہر کے وقت کلاس میں جب لڑکے گنگنا کر یاد کرتے تھے۔ باہر سکون طاری رہتا تھا۔ کچھ گرم ہوا کے جھونکوں میں نیم کے پھولوں کی بھینی بھینی مہک آتی تھی۔ اُس وقت جی چاہتا تھا۔

کیا جی چاہتا تھا۔ اس کو میں خود نہیں بتا سکتا۔ ہاں اتنا

ضرور کہہ سکتا ہوں۔ کہ ہندوستان کی آئندہ امید گاہوں۔
. . . . . . طالب علموں . . . . . . کو کورسے قواعد ہی
رٹانے میں زندگی گزار دینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

سکول سے واپس آکر گھر میں بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔
لیکن کسی سے ملنا اور بات چیت کرنا بھی ناپسند ہو چلا تھا۔
دماغ میں ہر وقت پریشانی سی موجود رہتی تھی۔ طبیعت گھبراتی
رہتی تھی۔ میں بالاخانے کی کھلی چھت پر دریا کی طرف منہ کر کے
بیٹھتا تھا۔ وہاں سے گھاٹ کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔ کبھی
کبھی فکر کے ہجوم ہونے پر میں گھاٹ کے منظر کو دیکھ کر طبیعت
کے بہلانے کی . . . . تسکین دینے کی . . . .
کوشش کیا کرتا تھا۔

میرا دل مجھے کہتا تھا۔ کہ اگر تم ستیاما کے شوہر ہوتے تو
تمہاری ضعیفی تک راحت سے گزرتی۔ تم ہوتے چلے گئے ۔۔
"گیری بالڈی" لیکن آخر ہو سکے کیا۔ ایک ہائی سکول کے سیکنڈ ماسٹر
ادیشوبد لال کیلیے . . . . . . جنہیں خاص کر ستیاما
ہی کی ضرورت نہ تھی۔ جن کے لئے شادی سے پہلے ہی سے روز
تک جیسے ستیاما تھی۔ ویسے منتی تھی . . . . آج

شیاما کے شوہر ہیں۔ وہ شیاما کو نہیں چاہتے۔ وہ محض خدمت کرنے والی عورت چاہتے ہیں۔ جب کوئی کام بگڑ جاتا ہے۔ تو ڈانٹتے ہیں۔ اور جب خوش ہوتے ہیں۔ تو زیور بنواتے ہیں خوب موٹے تازے۔ چکن پہنتے اور اُبٹنے، نہانے۔ کھانے پینے کمانے اور سو جانے کے پھیر میں پڑے رہتے ہیں۔ شیاما کے روٹھ جانے پر وہ کبھی آسمان کے تارے گن کر رات نہیں گزارتے۔

اسی درمیان میں سندر لال کو ایک مقدمہ کے لئے الہ آباد جانا پڑا۔ اُس روز اپنے گھر میں جس طرح میں تنہا تھا۔ شیاما بھی اپنے گھر میں اکیلی تھی۔ اُس روز شاید سوموار تھا۔ صبح ہی سے بادل گھرے ہوئے تھے۔ دس بجے سے پانی برسنے لگا۔ بڑے زور شور سے بارش شروع ہوئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے پانی کی رنگت دیکھ کر چھٹی کر دی۔ میں جیسے ہی گھر پہنچا۔ موسلادھار بارش ہونے لگی۔ اور ساتھ ہی زور کی ہوا بھی چلنے لگی۔ رفتہ رفتہ رات ہو گئی۔ رات کے ساتھ ہی آندھی پانی کا زور بھی دوگنا ہو گیا۔ برسات کا دریا کوس بھر کے عرض میں شور کرتا ہوا بہ رہا تھا۔ ایسی ہولناک رات میں سونے کی خواہش کرنی

فضول ہُوا کرتی ہے۔ بے ساختہ مجھے یاد آیا۔ کہ ایسی ہولناک رات میں میری ہی طرح شیاما بھی اپنے گھر میں اکیلی ہوگی میں نے سوچا شیاما جس گھر میں رہتی ہے۔ وہ کہنہ اور شکستہ ہے۔ اس کی نسبت میرا یہ نیا بنا ہُوا مکان مضبوط ہے۔ کئی مرتبہ جی میں آیا۔ کہ چل کر شیاما کو اس مکان میں لے آؤں۔ وہاں مکان گرنے سے بڑی خرابی ہو جائے گی۔ میں دروازے پر مندر میں سو رہوں گا۔ لیکن ایسے وقت اکیلی شیاما کے پاس جانے میں جی ہچکچا گیا۔

نصف رات گزر گئی۔ ایک بجے کے قریب آندھی پانی بڑا زور پکڑا۔ میں گھبرا کر دروازے پر آگیا۔ دروازے پر آتے ہی میں نے دیکھا۔ کہ کوئی عورت سُندر لال کے گھر سے نکل کر پانی میں اُتر آئی ہے۔ دیکھتے ہی میرے بال بال سے آواز آنے لگی۔ کہ شیاما ہے؟ شیاما کو دھواں دھار پانی میں ڈوبے ہوئے گھاٹ کے بُرج کی طرف آتے دیکھ کر میرے پاؤں گویا از خود اُس طرف کو اُٹھ گئے۔

گھاٹ غرقاب تھا۔ اِدھر اُدھر کی دونوں بُرجیاں ہاتھ ہاتھ بھر کھُلی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں اپنی اپنی طرف سے آکر اسی ہی

بارہ ہاتھ کے میدان میں آمنے سامنے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔

وہ قیامت کی گھڑی تھی۔ اُس وقت آسمان میں تاروں کی چمک نہ تھی۔ اور زمین کی تمام روشنیاں گُل ہو چکی تھیں۔ اُس وقت دو ایک بات کرنے میں کوئی ہرج نہ تھا۔ لیکن کسی نے کوئی بات نہیں کہی۔ خیریت تک نہ پوچھی۔

صرف اس زبردست تاریکی کی طرف دونوں دیکھتے رہے۔ پاؤں کے نیچے موت کا زبردست دھارا ہولناک شور کے ساتھ گویا تمام عالم کو ہضم کر جانے کے لئے دوڑا چلا جا رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے بڑھ چیاں بھی غرقاب ہو گئیں۔ ہم دونوں کمر کمر بھر پانی میں کھڑے تھے۔

آج ساری دنیا کو چھوڑ کر سُشیاما میرے پاس آ گئی۔ آج میرے سوا سُشیاما کا کوئی نہیں ہے۔ آج اتنے دنوں کے بعد اس روشنی سے معمور آدمیوں سے بھری دنیا کو چھوڑ کر اس خوفناک قیامت کی خاموش تاریکی میں سُشیاما تنہا میرے پاس کھڑی ہے۔ پیدائش کے چشمے نے اس ننھی کلی کو میرے پاس جگہ دی تھی۔ اور موت کے دھارا نے بھی اس کھلے ہوئے

پھول کو میرے پاس پہنچا دیا ہے۔ اس وقت ہاتھ دو ہاتھ پانی اور چڑھ جائے۔ تو ایک ہی لہر میں ہم دونوں بچپن کے نہ جدا ہونے والے انداز سے پھر مل جائیں۔

لیکن نہیں! وہ لہر نہ آئی۔ شیاما اپنے شوہر کے ساتھ آرام سے زندگی بسر کرے۔ میں اتنی ہی دیر عظیم الشان تباہی کے پاس کھڑے ہو کر بے انتہا راحت کی لذت پا گیا۔

چار بج گئے۔ پانی بھی آہستہ آہستہ برج کے نیچے سے گزر گیا۔ شیاما بھی بغیر کچھ کہے۔ اپنے گھر چلی گئی۔ میں بھی خاموش چلا آیا۔

میں نے اپنے دل میں کہا۔ میں نہ ناظر ہوا۔ اور نہ سررشتہ دار "رگیری بالڈی" بھی نہیں ہوا میں صرف ایک ہائی سکول کا سیکنڈ ماسٹر ہوں۔ میری اس تمام زندگی میں تھوڑی دیر کے لئے ایک آخری رات کا ظہور ہوا تھا ...... اپنی عمر کے تمام دنوں میں کچھ انہی گھنٹوں کو میں کامل طور پہ کامیاب سمجھتا ہوں"

خاموش محبت

لڑکی کا نام جس وقت سوبھاشینی رکھا گیا۔ کون کہہ سکتا تھا۔ کہ وہ بڑی ہو کر گونگی ہوگی۔ اُسکی دو بڑی بہنوں کا نام سکشینی اور سوہاشینی تھا۔ اور اسی لحاظ سے اُس کے باپ نے اُس کا نام سوبھاشینی رکھا تھا۔ مگر اختصار کے طور پر اُسے سوبھا کہا کرتے تھے۔

بڑی بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ اب یہ چھوٹی بیٹی اپنے والدین کے دل پر ایک خاموش بوجھ کے مثال تھی۔ لوگ خیال کرتے تھے۔ کہ چونکہ وہ بول نہیں سکتی۔ اس لئے اپنی شادی کی ضرورت بھی محسوس نہ کر سکتی ہوگی۔

وہ بچپن سے سمجھتی تھی۔ کہ خدا نے اُسے اپنے والدین کے گھر لعنت و ملامت کے لئے بھیجا ہے۔ اِس لئے وہ عوام سے دور رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اگر کسی وقت وہ سب اُس کو بھول بھی جاتے۔ تو وہ یہ داشت کر لیتی۔ مگر درد کو کون بھول

سکتا ہے؟ اس کی وجہ سے والدین رات دن فکر مند رہتے تھے۔ خصوصاً اس کی ماں بڑی کابے چین نظروں سے اُسے دیکھتی تھی۔

ماں کو بیٹے کی بہ نسبت بیٹی سے زیادہ محبت ہوتی ہے اس میں کوئی عیب اگر ہو۔ تو اپنی ذلت و توہین کا سبب سمجھتی ہے۔ بنی کنٹھا۔ سوبھا کا باپ بہ نسبت اور بیٹیوں کے اُس سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ مگر اُس کی ماں اُسے اپنے جسم کا ایک بدنما داغ خیال کرتی تھی۔

سوبھا میں گویائی نہ تھی۔ تو کیا اُس کی بڑی بڑی اور سیاہ آنکھیں نہ تھیں۔ جس وقت کوئی خیال اُسکے دماغ میں پیدا ہوتا اُس کے ہونٹ پھول کی پتی کی طرح متحرک ہو جاتے۔

جب ہم اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ اور بولتے ہیں۔ تو اُسکی ابتدا کے لئے الفاظ کا تجویز کرنا کوئی آسان کام نہیں خیال کی ترجمانی کا ایک قاعدہ ہوتا ہے۔ جو اکثر غلط بھی ہوتا ہے اُسی میں پڑ کر ہم غلطی بھی کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن سیاہ آنکھیں ترجمانی کے لئے الفاظ کی محتاج نہیں ہوتیں۔ دماغ خود بخود اُن پر ایک سایہ ڈالتا ہے۔ اور اُن میں خیال کی جھلک نمایاں ہو کر کھو جاتی

ہے۔ خیال پتلیوں کی سیاہی سے اسی طرح نمودار ہوتا ہے جس
طرح طلوع ہونے والا آفتاب یا بادلوں میں چمکنے والی بجلی۔
جو لوگ فطرتاً سوا ہونٹ ہلانے کے قوت گویائی نہیں
رکھتے۔ وہ آنکھوں سے زبان کا کام لیا کرتے ہیں جن کی قوت
اظہار بے تھاہ گہرے سمندر کی طرح اور صفائی صاف اور نیلگوں
آسمان کی طرح ہوا کرتی ہے۔ گویا گونگوں میں قدرت کا ایک
شاندار ثروت پایا جاتا ہے۔

سوبھا چاندی پور ایک چھوٹے سے موضع میں رہا کرتی تھی
دریا جس کے کنارے پہ یہ آبادی تھی۔ بنگال کے دریاؤں میں ایک
چھوٹا دریا تھا جس کا جسم ایک معمولی حیثیت کی ندی سے
زیادہ نہ تھا۔ گویا کبھی سیلاب نہ لایا۔ وہ گاؤں کے ہر فرد
کے خاندان کا ایک دوادار رکن معلوم ہوتا تھا۔ اور اس کے
ہر دو کنارے سایہ دار تھے۔ اس طرح گویا دریا کی خوبصورت
ندی اپنے شاہانہ تخت سے اتر کر گمنامی کی خانہ بدوش ہو گئی
تھی۔ اس کی روانی اپنے سب سے اپنے کام کی انجام دہی میں
مشغول رہتی۔ اور ہزاروں دلوں سے دعائیں لیتی۔ بنی کنٹھا کا
مکان اسی کے کنارے کی طرف آبادی سے نکلا ہوا تھا۔ اور کشتی میں

بیٹھنے والے کو آبادی کی ہر جھونپڑی اور مکان کی ہر چمنی صاف نظر آتی تھی۔

معلوم نہیں۔ کہ اس دنیاوی دولت کے درمیان اس چھوٹی لڑکی کا بھی کسی کو خیال تھا۔ کہ نہیں۔ جو اپنا کام کر کے چپکے سے چشمے کے کنارے آ بیٹھتی۔ اور قدرت کی خاموشی سے ہمکلام رہتی تھی۔

اس جگہ چشمے کی روانی کی آواز، گاؤں کے باشندوں کا شور و غل، چڑیوں کے چہچہے اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ ایک دوسرے سے مل کر اس کے دل کا اضطراب بن جاتیں۔ اور آواز کی ایک بڑی موج بن کر اس کے مضطرب دل پر ایک ضرب لگاتیں۔ اور یہی شور و غل اور قدرت کی نیرنگیاں اس لڑکی کی گویائی تھی۔ سیاہ آنکھیں اس کی زبان تھی۔ جن پر لمبی پلکیں سایہ کئے ہوئے تھیں۔ اور وہی شور و غل اس کے نزدیک دنیا والوں کی زبان تھا۔ اس جگہ سو کھا کے نزدیک، درخت کی چوٹیوں سے لے کر خاموش ستاروں تک رونے اور سرد آہیں بھرنے کا سامان مہیا تھا۔

ٹھیک دوپہر کو جب ملاح اور ماہی گیر کھانا کھانے چلے جاتے

جب گاؤں والے سو جاتے۔ جب چڑیاں خاموش ہو جاتیں،
جب گھاٹوں پر سکوت چھا جاتا۔ جب دُنیا تھک کر خاموش ہو
جاتی اور تنہائی کی ایک خوفناک صورت اختیار کر لیتی۔ اس وقت
ایک بوجھل آسمان کے نیچے، قدرت اپنی گونگی زبان لئے موجود
ہوتی۔ یا یہ گونگی لڑکی بیٹھی ہوتی۔

سُبھا کے گھر دو گائیں تھیں۔ ایک سرب باشی، دوسری پنگولی
ان دونوں نے سُبھا کے مُنہ سے کبھی اپنا نام نہیں سُنا تھا۔
تاہم وہ اس کے پاؤں کی آواز خوب پہچانتی تھیں۔ ان کے زبان
نہ تھی۔ مگر وہ اس کی مشفقانہ مگر بے معنی گفتگو خوب سمجھتی تھیں۔
سُبھا اُن تک آتی۔ اور سرب باشی کی گردن میں اپنے دونوں
ہاتھ ڈال دیتی۔ اپنے رخسار اس کے رخساروں سے ملتی۔ اسی اثنا
میں پنگولی اسے اپنی مہربان آنکھوں سے دیکھتی۔ اور اس کے چہرے
کو چاٹنے لگتی۔ سُبھا کم از کم تین مرتبہ انہیں روزانہ دیکھنے آتی۔ اور
زیادہ سے زیادہ جتنی مرتبہ بھی ہو سکتا۔ جب کوئی اُسے بُرا بھلا کہتا۔
وہ اپنے ان گونگے دوستوں کے پاس آجاتی۔ خواہ وقت اس کے
آنے کا ہو یا نہ ہو۔ اور گائیں اُسکے روحانی درد اور خاموش زندگی
کا اثر اپنے دل پر محسوس کرتیں۔ اس کے نزدیک آکر اپنے سینگ آہستہ

آہستہ اُس کے بازوؤں سے رگڑتیں۔ اور اپنی بدحواسی اور بے زبانی کے طریق پر اُس کا غم غلط کرنے کی کوشش کرتیں گایوں کے علاوہ اُس کے گھر بکریاں اور ایک بلی کا بچہ بھی تھا۔ مگر وہ اُن سے اتنی محبت نہ رکھتی۔ گو وہ سب اُسے ویسی ہی محبت کی نگاہ سے دیکھتے دن رات میں بلی کا بچہ جب کبھی موقع پاتا۔ اُس کی گود میں آبیٹھتا اور جب شوبھا اپنی اُنگلیاں اُس کی پشت اور گردن پر پھیرتی تو وہ سو جاتا۔

اشرف المخلوقات میں بھی سوبھا کا ایک دوست تھا۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اُس کے تعلقات اُس کے ساتھ کس قسم کے تھے۔

اُس میں گویائی تھی۔ اور اس کی گویائی شوبھا کی خاموش گویائی کو بعض اوقات چھین لیتی۔ وہ دوست گوسائیں کا چھوٹا لڑکا پرتاپ تھا جو بے کار پھرتا تھا۔ اور جس کے والدین کی اُمیدیں اُس کے طریق معاش کے متعلق منقطع ہو چکی تھیں۔

ناکارہ آدمی اپنے عزیزوں کو ناراض کر کے غیر لوگوں میں ہر دلعزیز ہوا کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ عوام کی ملکیت ہو جاتے ہیں۔ جسطرح ایک شہر کو ایک کُشادہ

ہمدردان کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ لوگ آرام سے سانس لے سکیں اسی طرح ایک موضع کو چند بیکار آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ باکار آدمیوں کا بیکار وقت اپنی غپ شپ میں گزار سکیں۔ اور جس وقت کسی کو اُن کی ضرورت ہو۔ تو فوراً موجود ہوں۔

پرتاپ کا خاص شوق مچھلیاں پکڑنا تھا۔ اس شوق میں وہ اپنا بہت سا وقت ضائع کرتا۔ اور قریب قریب ہر سہ پہر کو اسی میں مشغول پایا جاتا۔ اپنے اسی شوق کے توصل سے وہ سوکھا سے روشناس ہوا۔ خواہ وہ کچھ بھی کام کرتا تھا۔ مگر ایک دوست کا قدردان ضرور تھا۔ اور صحیح ہے۔ کہ جب کوئی مچھلیاں پکڑتا ہو تو ایک خاموش دوست اُس کا بہترین دوست ہوا کرتا ہے۔ پرتاپ اُسکی خاموشی کی وجہ سے سوکھا کی بہت عزت کرتا۔ اور اُس کا پورا نام لینے کی بجائے صرف "سو" کہہ کر پکارتا۔

سوکھا ایک املی کے درخت کے نیچے بیٹھی رہتی۔ اور پرتاپ ذرا دور ہٹ کر اپنی ڈور ڈالے رہتا۔ وہ اپنے ساتھ روزانہ چند پان لایا کرتا۔ جن کو سوکھا وہاں بیٹھی ہوئی اُس کے لئے بنایا کرتی۔

دیر تک بیٹھے رہنے اور یہ کیفیت دیکھتے رہنے کے دوران میں سوکھا کی دلی خواہش ہوتی۔ کہ وہ اپنے تئیں پرتاپ کا ایک بڑا

مددگار ثابت کرے۔ اور یہ ثابت کر دے۔ کہ وہ اس دنیا پر بیکار بوجھ نہیں ہے۔ مگر وہاں اس اظہار کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ وہ خدا سے ایک غیر معمولی طاقت حاصل کرنے کی دعا کرتی۔ تاکہ وہ اپنی کرامات سے پرتاپ کو متحیر کر سکے۔ اور اس کی زبان سے یہ الفاظ سن سکے "میرے خواب میں بھی نہ تھا۔ کہ میری سوبھا ایسا کر سکے گی"۔

خیال کیجئے۔ کہ اگر سوبھا کوئی پری ہوتی۔ تو وہ دریا سے آہستگی کے ساتھ اٹھتی۔ اور بجائے ایک حقیر چیز مچھلی کے پرتاپ کے لئے ایک سانپ کا من کنارے پر لا ڈالتی۔ اور پرتاپ اُسوقت اپنا شکار چھوڑ کر اُس دریا میں غوطہ مارتا۔ اور کسی اور ہی دنیا میں جا پہنچتا۔ اور دیکھتا کہ یہی کنٹا کی گونگی بیٹی سوبھا چاندی کے محل میں زریں بستر پہ آرام فرما ہے۔ اُس وقت سوبھا جواہرات سے منور ہونے والے شہر کے بادشاہ کی بیٹی معلوم ہوتی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ ناممکن تھا۔ ویسے ناممکن تو حقیقتاً کوئی کام نہیں۔ مگر مشکل تو یہ بات تھی۔ کہ وہ پاتالپور کے شاہی خاندان میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ گوسائیں کے لڑکے کو متحیر کرنے کا کوئی ذریعہ نہ پاتی تھی۔

شوبھا بڑھتی گئی۔ اور رفتہ رفتہ اپنے آپ کو جانتی گئی۔ اس دوران میں ایک ناقابلِ اظہار خیال، سمندر کے وسطی مقامات سے اٹھنے والی موجوں کی طرح جبکہ چاند پورا ہوتا ہے۔ اُسکے دماغ سے پیدا ہوا۔ اور وہ اپنے آپ کو اوپر سے نیچے تک دیکھتی۔ اور سوال کرتی۔ مگر کوئی ایسا جواب نہ پاتی جسے وہ سمجھ سکتی۔

ایک دن، رات کے جب پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے مکان کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ اور ڈرتے ڈرتے باہر جھانک کر دیکھا۔ اُس وقت قدرت بھی شوبھا کی طرح تنہا، خوابیدہ زمین کو دیکھ رہی تھی۔ شوبھا کی مضبوط اور جوان زندگی یہ عالم دیکھ کر بے تاب ہو گئی۔ اور رنج و خوشی سے اُس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ پہلے تو وہ تنہا تھی۔ مگر اس عالمِ تنہائی نے اُس کے خیال کو اور بھی شدید بنا دیا۔ اس وقت اُس کا دل بھاری ہو گیا۔ اور وہ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکال سکی۔ گویا خاموش دھرتی ماتا کے ایک کنارے پر، ایک خاموش اور ایک پریشان لڑکی کھڑی تھی۔

شوبھا کی شادی کے خیال نے اُس کے والدین کو بڑی فکر میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ لوگ اکثر انہیں برا بھلا کہتے اور اپنی برادری

سے خارج کر دینے کی دھمکی دینے۔ بنی کنٹا ویسے خوشحال تھا۔ اس کے گھر روزانہ دونوں وقت چاول اور مچھلی پکتی، اس لئے اُس کے حاسد بھی کم نہ تھے۔ عورتوں کے کہنے سننے سے بنی کنٹا کچھ دن کے لئے وطن سے چلا گیا۔ اور تھوڑے ہی دن بعد واپس آکر کہنے لگا "ہم کو کلکتہ چلنا چاہیئے" اور وہ اس اجنبی جگہ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ دیکھ کر سوبھا کا دل بھر آیا۔ آنکھیں گہر آلود صبح کی طرح تر ہو گئیں۔ اور ایک نامعلوم خوف کی وجہ سے جو اس کے دل میں جم چکا تھا۔ ایک بے زبان جانور کی طرح وہ اپنے والدین کے پیچھے پڑ گئی۔ اپنی لمبی اور بڑی بڑی آنکھوں سے ان کا منہ تکتی اور اُن کے ارادے معلوم کرنا چاہتی۔ مگر وہ ایک لفظ منہ سے نہ کہتے۔

ان تمام باتوں کے دوران میں ایک سہ پہر کو پرتاپ شکار کرتے کرتے یہ کہہ کر ہنسا۔ "سو" انہوں نے تمہارے لئے شوہر تلاش کر لیا۔ اور اب تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ دیکھو تم مجھے بالکل نہ بھول جانا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کام میں پھر مشغول ہو گیا۔

جس طرح خوف زدہ ہرنی اپنے شکاری کا منہ تکتی ہے۔

اور اپنی خاموش تکلیف میں دریافت کرتی ہے "میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" اسی طرح سوبھا، پرتاپ کی طرف دیکھتی رہی اور اُس روز زیادہ دیر نہ بیٹھی۔

بنی کنٹھا اپنی خوابگاہ میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ جب سوبھا نے اُسے دیکھ کر روتے ہوئے اپنے تئیں اُس کے پاؤں پر لا ڈالا۔ بنی کنٹھا نے اُسے تسلی دینی چاہی۔ اور خود اُس کے رخسار بھی اشک آلود ہو گئے۔

آخر یہ طے پایا۔ کہ وہ آئندہ صبح کو کلکتہ روانہ ہو جائیں گے۔ سوبھا نے گاؤں کے کھنان کے قریب آکر اپنے پرانے دوستوں کو الوداع و خیرباد کہا۔ ایک بار پھر اپنے ہاتھوں سے کھلا بار گلے سے لگایا۔ ان کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اور اُس کی وہ آنکھیں جو زبان کا کام دیتی تھیں۔ تیزی کے ساتھ آنسو بہانے لگیں جس رات کا یہ واقعہ ہے۔ وہ چاند کی دسّ تاریخ تھی۔ سوبھا اپنے کمرے سے نکل کر اپنے دل پسند گھاس کے بستر پر دریا کے کنارے آبیٹھی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ زمین پر اس طرح پھیلا دئے گویا وہ اپنی مضبوط و پُر سکوت ماں سے کہہ رہی ہے۔ "ماں! مجھے اپنے سے جدا نہ ہونے دو۔ اپنے آغوش میں مجھے بھی

اسی طرح سے لو۔ جس طرح میں نے تمہیں لے رکھا ہے۔ اور مجھے مضبوطی سے پکڑے رہو۔"

ایک دن کلکتہ کے کسی مکان میں سوبھا کی ماں نے سوبھا کو بہت احتیاط کے ساتھ کپڑے پہنائے۔ اس کا سر گوندھا۔ اسے زیور پہنایا۔ یہ دیکھ کر سوبھا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اس کی ماں نے یہ خیال کر کے کہ اس کی آنکھیں روتے روتے سوُج نہ جائیں۔ اسے گھُرکا اور مارا۔ مگر اس کا رونا بند نہ ہوا۔

اسی اثناء میں دولہا مع ایک دوست کے دلہن کا معائنہ کرنے اندر آیا۔ سوبھا کے والدین اس وقت خوف زدہ تھے کہ دیکھئے، یہ دیوتا اس قربانی کے جانور "سوبھا" کو پسند بھی کرتا ہے۔ یا نہیں؟۔

پسند کرنے والوں کے روبرو بیٹھنے سے پیشتر سوبھا کی ماں سوبھا کو خاموش رہنے کی تلقین کر چکی تھی۔ مگر اس بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔

دولہا نے اسے دیر تک اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اور کہا "ایسی خراب بھی نہیں ہے"

اُس نے اُس کے رونے پر خاص توجہ کی۔ اور خیال کیا۔ کہ یہ اُس کے نرم دل ہونے کی دلیل ہے۔ اور اپنے دل میں اس موضوع پر بحث کی۔ کہ وہ دل جو آج اپنے والدین سے جُدا ہونے پر اس قدر ملول ہے۔ کل یقیناً اچھا ثابت ہوگا۔ آنسوؤں نے جو اصل قیمتی موتی تھے۔ سوبھا کی قدر و منزلت بڑھا دی۔ اور دولہا نے سوبھا میں کوئی نقص نہ پایا۔ آخرکار جنتری دیکھی گئی۔ اور ایک مبارک دن شادی کے لئے تجویز ہوا۔ اور اپنی گونگی لڑکی کا ہاتھ ایک دوسرے کے حوالے کرکے سوبھا کے والدین اپنے وطن کو واپس آ گئے۔ انہوں نے خدا کا شکر کیا۔ کہ وہ دین و دُنیا کی بُرائی سے بچ گئے۔

سوبھا کے شوہر کا کاروبار کسی مغربی شہر میں پھیلا ہوا تھا۔ اس لئے شادی کے تھوڑے ہی دن بعد وہ اُسے بھی وہیں لے گیا۔ دس دن سے بھی کم عرصے میں سب کو معلوم ہو گیا۔ کہ دُلہن گونگی ہے۔ اگر ایک آدھ آدمی کو اسکی خبر نہ ہوئی۔ تو انہیں سوبھا کا کیا قصور تھا۔ اُس نے کسی کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کی تھی۔ اُسکی آنکھیں انہیں اصل بات بتاتی تھیں۔ اگرچہ کوئی نہ سمجھتا تھا۔ وہ ہر ایک پر نظر ڈالتی۔ مگر کوئی اسکی بات نہ سمجھتا۔ وہ بچپن

سے جو اس کی زبان سمجھتے تھے۔ افسوس وہ چھوٹ چلے تھے
اس لئے اُس کے خاموش دل میں بے آواز آہ و بکا نہ تھمنے
والے رونے کی آواز آتی تھی۔ جس کو صرف دل کا حال جاننے
والا ہی سُن سکتا تھا۔

کفّارۂ گناہ
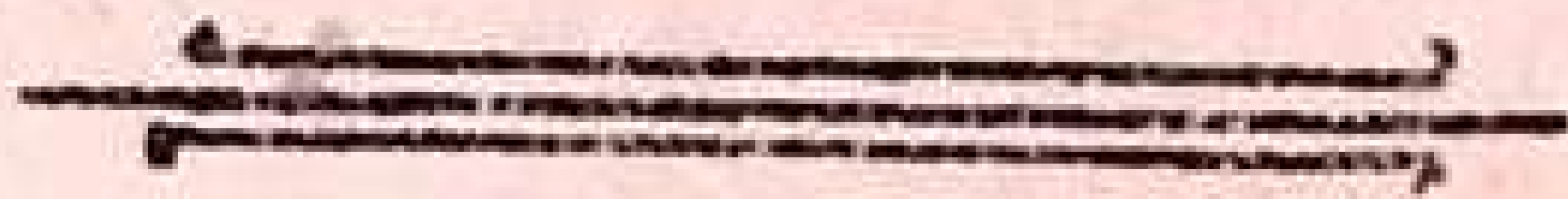
رائے چرن بارہ سال کا تھا جب وہ بطور ملازم اپنے آقا کے مکان میں آیا۔ یہاں اُسے اپنے مالک کے معصوم لڑکے کو کھلانے کا کام سپرد کیا گیا۔ وقت گزرتا گیا۔ اور لڑکے کو رائے چرن کی آغوشِ محبت چھوڑ کر سکول میں داخل ہونا پڑا۔ سکول سے کالج اور کالج کے بعد وہ جج کے عہدہ پر ممتاز ہوا۔ رائے چرن ہمیشہ جب تک کہ اُسکی شادی نہ ہوئی۔ اُس کا تنہا معاون و مددگار رہا۔ مگر جب نئی مالکہ نے آکر مکان کو زینت بخشی۔ تو رائے چرن کے واسطے ایک مالکہ سے دو ہو گئے۔ اور وہ اب نئی مالکہ کی خدمت گزاری میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایک نئے مہمان نے اُس کی خدمت گزاری کو اپنی طرف راغب کر لیا۔ یعنی انوکل کے ایک لڑکا تولد ہوا۔ اور رائے چرن نے اپنی خدمت و محبت سے اُس پر پورا پورا تسلط حاصل کر لیا۔

وہ چھوٹے بچّے کو گود میں اُچھالا کرتا۔ بچّوں کی زبان میں اُس سے باتیں کرتا۔ اپنے مُنھ کو بچّے کے مُنھ پر رکھتا اور ایک خفیف سی آواز کے ساتھ اپنے مُنھ کو کھینچ لیتا۔

اب بچّہ گھٹنوں کے بَل چلنے لگا۔ وہ دروازہ تک چلا جاتا اور جب رائے چرن اُسے پکڑنے جاتا۔ تو وہ شرارت کا رونا رونے لگتا۔ اور چھُپ جانے کی کوشش کرتا۔ رائے چرن اُس کی اس شرارت پر متعجّب ہو جاتا تھا۔ اور اپنی مالکہ سے ایک عجیب انداز سرور میں کہتا "آپ کا نورِ نظر کبھی دِق جج ہوگا۔" جب وہ بچّہ زمین پر گھٹنوں کے بَل چلنے لگا۔ تو رائے چرن کے لئے انسانی تاریخ میں یہ خاص واقعہ تھا جب وہ اپنے باپ کو "بابا" ماں کو "ماما" اور رائے چرن کو "چانّنا" کہتا تو رائے چرن اپنی مسرّت کی کوئی انتہا نہ سمجھتا۔ کچھ عرصہ بعد رائے چرن کو اپنی محبّت دیگر طریقوں سے دکھانا پڑی۔ اُس کو لگام دانتوں میں دبائے ایک گھوڑے کا فرض ادا کرنا پڑتا۔ اُس کو اس چھوٹے سے بچّے سے کشتی لڑنی پڑتی اور اگر وہ شکست کھا جاتا۔ تو ایک بہت خوشی کی آواز سنائی دیتی۔

تقریباً اسی زمانہ میں انوکل کا تبادلہ دریائے پدما کے نزدیک ایک ضلع میں ہو گیا۔ کلکتہ سے وہ اپنے کمسن بچے کے لئے ایک چھوٹی گاڑی ایک خوبصورت واسکٹ۔ ایک طلائی ٹوپی اور ہاتھ کے لئے طلائی زیورات لایا۔ اور جب کبھی رائے چرن اُسے سیر و تفریح کے لئے باہر لے جاتا۔ تو وہ ان سب چیزوں کو خوشی خوشی اُسے پہنا دیتا۔

موسمِ باران کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور دن بدن بارش کی زیادتی ہوتی جاتی تھی۔ تشنہ لب بدماشل ایک افعی کے اونچے مقامات، دیہات اور مزروعات کو نگل چکی تھی۔ اور اپنی طغیانی سے لمبی لمبی گھاسوں کو چھپا چکی تھی۔ کبھی کبھی دریا کی ایک زوردار گرج کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اور یہ آواز بہت دُور تک چلی جاتی۔ تیزی سے بہتے ہوئے جھاگ کے ٹکڑے دریا کی تیز رفتاری کا ثبوت دیتے تھے۔

ایک شام کو جبکہ مینہ برس کر ختم گیا تھا۔ گہرا ابر چھایا ہوا تھا۔ رائے چرن کے کمسن مالک نے ایسے دل رُبا وقت میں گھر میں بیٹھے رہنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اُچک کر اپنی ننھی سی گاڑی پر بیٹھ گیا۔ رائے چرن گاڑی کھینچتا ہوا آہستہ

آہستہ دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ دریا پہ کوئی کشتی نہ تھی۔ چاول کے کھیت خالی پڑے ہوئے تھے۔ اور دریا کی دوسری طرف بادل آ کر جمع ہو رہے تھے۔ اس منظرِ خاموش میں بچّہ نے اپنی چھوٹی انگلی سے اُس کی طرف اشارہ کیا۔ اور پکار اٹھا!

.... وہ۔

دلدل کے قریب ہی ایک بڑا کدمبا کا درخت پھولوں سے لدا ہوا کھڑا تھا۔ لڑکے نے اُس درخت کی طرف للچائی ہوئی نظر ڈالی۔ اور رائے چرن اس نگاہ کا مطلب سمجھ گیا۔ مگر رائے چرن کی طبیعت اس وقت بالکل نہ چاہتی تھی۔ کہ اس دلدل کو پار کر کے پھولوں کو توڑنے جائے۔ اُس نے بہت سُرعت کے ساتھ اپنی انگلی سے دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو .... دیکھو۔ اس طائر کو۔"

اور یہ کہہ کر وہ گاڑی کو ایک دوسرے مقام پہ لے گیا۔ مگر وہ بچّہ جو جج ہونے والا تھا۔ کس طرح اس خیال کو اس قدر جلد فراموش کر سکتا تھا۔

علاوہ ازیں وہاں اس وقت کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی۔ جو اُسکی آنکھوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ بچّہ اسی درخت کا

خیال کر رہا تھا۔ کہ رائے چرن نے مجبوراً کہا" بہت اچھا خوبصورت بچے! تم گاڑی میں خاموش بیٹھے رہو۔ اور میں جاکر اُن خوبصورت پھولوں کو لاتا ہوں۔ صرف اتنا خیال رکھنا کہ دریا کے قریب مت جانا" یہ کہہ کر وہ برہنہ پا، دلدل کیطرف بڑھا۔ اور اُس کو پار کرنے لگا۔ مگر جیسے ہی رائے چرن گیا۔ لڑکا جوئے ممنوع کی طرف بڑھا۔ اُس نے اپنے نزدیک دریا کو بہتے اور اُچھلتے دیکھا۔ لہروں کی ان شرارتوں کو دیکھ کر بچہ کا دل بھی بیقرار ہونے لگا۔ وہ بہت آہستگی سے گاڑی سے اُترا۔ اور دریا کی طرف بڑھا۔ راستہ میں اُسے ایک چھوٹی لکڑی بھی مل گئی۔ اور وہ دریا پر جھکا۔ گویا وہ شکار کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ دریا کی شریر پریاں اپنی عجیب آواز سے بچے کو دریا میں آنے کی دعوت دینے لگیں۔

رائے چرن بہت سے پھول توڑ چکا تھا۔ اور انہیں اپنے دامن میں بھر کر مسکراتا ہوا واپس آرہا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ گاڑی تک پہنچا۔ اُس نے وہاں کسی کو نہ پایا۔ اُس نے ہر طرف دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ اُس کا دل زور زور سے حرکت کرنے لگا۔ اُسکی نظروں میں تمام کائناتِ عالم ایک

تاریک کہرے کی طرح چکر لگانے لگی۔ اُس نے اپنے شکستہ دل کی گہرائی سے ایک چیخ نکالی۔ ماسٹر! ماسٹر! اکمسن ماسٹر!!" مگر کسی آواز نے "جا نتا" کہہ کر جواب نہ دیا۔ کوئی لڑکا شرارت سے نہ ہنسا۔ کسی بچے کے رونے کی آواز نے اُسے مسرور نہ کیا۔ صرف دریا اُچھلتا اور شور مچاتا بہ رہا تھا۔ گویا وہ کچھ نہ جانتا تھا۔ اسے بچے کی موت کی بالکل خبر نہ تھی۔

اب شام ہو چکی تھی۔ رائے چرن کی مالکہ بہت زیادہ متفکر ہونے لگی۔ اُس نے ان کی تلاش و جستجو کے واسطے ہر طرف آدمی دوڑائے۔ وہ لالٹین ہاتھوں میں لے کر چلے۔ اور آخر کار دریائے پدما کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے رائے چرن کو اِدھر اُدھر کھاتے ہوئے عجیب مجنونانہ حالت میں مثل طوفانی ہوا کے یہ چلاتے ہوئے پایا۔ "ماسٹر۔ ماسٹر۔"

جب لوگ اُسے گھر لائے۔ تو وہ اپنی مالکہ کے قدموں پر گر پڑا۔ ان لوگوں نے اُسے مخاطب کیا۔ اُس سے سوال کئے اور بار بار پوچھا۔ کہ وہ بچہ کہاں چھوڑ آیا ہے۔ مگر وہ جو کچھ کہہ سکا۔ وہ یہ تھا۔ کہ اُسے کچھ نہیں معلوم۔ باوجودیکہ سب کو خیال تھا۔ کہ دریائے پدما نے بچہ کو ہضم کر لیا۔ مگر پھر بھی

بعض افراد کو اسمیں شک تھا۔ کیونکہ اس شام کو خانہ بدوشوں کا ایک گروہ گاؤں کے باہر دیکھا گیا تھا۔ اور کچھ شبہ اُن لوگوں پر بھی تھا۔

ماں اپنے غم و اندوہ کی وجہ سے یہاں تک خیال کرنے لگی تھی۔ کہ رائے چرن نے اُس کے بچّہ کو چرا لیا ہے۔ اُس نے رائے چرن کو علیحدہ بُلا کر بہت ملتجیانہ انداز میں کہا:۔
"رائے چرن میرے بچّہ کو مجھے واپس کر دو۔ میرے بچّہ کو مجھے واپس کر دو۔ تم مجھ سے جس قدر روپیہ چاہو لے لو۔ مگر صرف میرے بچّہ کو مجھے دے دو" رائے چرن۔

صرف جواب میں اپنی پیشانی کو ٹھونکتا تھا۔ آخر کار مجبوراً مالکہ نے اُسے گھر سے نکال دیا۔ انوکل نے چاہا۔ کہ اپنی بیوی کے دل سے اس شبہ کو دور کرے۔ اُس نے کہا "وہ کیوں ایسا گناہ کرتا" ماں صرف اتنا کہہ دیتی "بچّہ طلائی زیور ات پہنے ہوئے تھا۔ یہ حال تمہارے سوا کون جانتا ہے؟" اسکے بعد اُسے کچھ اور سمجھانا فضول تھا۔

(۲)

رائے چرن اپنے گاؤں کو لوٹ گیا۔ اِس وقت اُس

کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اور کوئی امید بھی نہ تھی۔ کہ اُس کے کوئی اولاد پیدا ہو گی۔ مگر ایسا اتفاق ہوا۔ کہ اسی سال کے آخر میں اُس کے یہاں ایک لڑکا تولد ہوا۔ اور اس ولادت کے بعد ہی اُس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ بی بی کی موت کی وجہ سے رائے چرن کے دل میں اس بچہ کی طرف سے ایک نفرت سی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر اُس کے دماغ میں بہت جلد یہ بات سما گئی۔ کہ یہ بچہ چھوٹے ماسٹر کے بدلے میں پیدا ہوا ہے۔

وہ اسے ایک جرم سمجھتا تھا۔ کہ وہ اپنے لڑکے کے ساتھ شاداں رہے۔ جبکہ اُس کے مالک کا لڑکا اُسی کے ہاتھوں کھو چکا تھا۔ حقیقت میں اگر اُس کی بیوہ بہن جس نے لڑکے کی نگہداشت کی نہ ہوتی۔ تو وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکتا۔ رائے چرن کے دماغ میں ایک عظیم تغیر آہستہ آہستہ پیدا ہو چلا تھا۔ یہ نیا بچہ گھٹنوں کے بل چلنے اور دروازہ تک شرارت سے جانے لگا تھا۔ اُس کی آواز اُس کا مسکرانا۔ اُس کا رونا بالکل چھوٹے ماسٹر سے مشابہ تھا۔

ایک دن جبکہ رائے چرن نے اُس کے چلّانے کی آواز سُنی اُس کا دل زور زور سے حرکت کرنے لگا۔ اور اُسے ایسا

معلوم ہُوا۔ کہ اُس کا مرحوم کمسن ماسٹر موت کے غیر معلوم ملک میں چلا جا رہا ہے۔ کیونکہ اُس نے اپنے چا ننا کو کھو دیا ہے۔

فیلنا (کیونکہ بچّہ کا یہی نام اُس کی بیوہ ہمشیرہ نے رکھا تھا۔ بہت جلد باتیں کرنے لگا) وہ بچّوں کی آواز میں "بابا" اور "ماما" کہنے لگا۔ اور جب رائے چرن نے ان شنیدہ آواز دل کو سُنا۔ تو یہ راز بہت جلد اُس پر کُھل گیا۔ چونکہ مرحوم ماسٹر چا ننا کو چھوڑ کر علیٰحدہ نہ رہ سکتا تھا۔ اس لئے وہ اُسی کے گھر میں پیدا ہُوا۔ رائے چرن کو تسلّی دینے کے واسطے حسب ذیل خیالات کافی تھے۔

(۱) یہ نیا بچّہ چھوٹے ماسٹر کی موت بعد بہت جلد پیدا ہُوا۔

(۲) اس کی بیوی اس عمر میں بچّہ نہ پیدا کر سکتی تھی۔

(۳) نیا بچّہ اُسی طرح چلتا اور "بابا" اور "ماما" کہتا تھا۔ اور کوئی بات ایسی نہ تھی۔ جو مرحوم ماسٹر سے ملتی جلتی نہ ہو۔

رائے چرن کو اپنی مالکہ کا خیال آگیا۔ وہ اپنے دل میں کہنے لگا "اُس کی ماں کا خیال ٹھیک تھا۔ وہ جانتی تھی۔ کہ مَیں نے

ہی اُس کا بچہ چرا لیا ہے"۔ جب وہ اس خیال پر پہنچ گیا۔ تو وہ اپنی گزشتہ لاپرواہی کی وجہ سے غم سے بھر گیا۔ اور اب اُس نے ہمہ تن بچے کی نگہداشت اور خدمت گزاری کرنا شروع کی۔

اُس نے بچہ کو اس طرح پرورش کرنا شروع کیا۔ کہ گویا وہ ایک رئیس کا لڑکا ہے۔ اُس نے ایک گاڑی ایک خوبصورت واسکٹ اور ایک سنہری ٹوپی خرید دی۔ اپنی مرحوم بیوی کے زیورات سے بچہ کے لئے طلائی کپڑے وغیرہ بنوا دیئے۔ وہ اپنے لڑکے کو دوسروں کے ساتھ کھیلنے سے بھی منع کرتا اور دن رات اُس کے ہمراہ رہتا۔ جب وہ بڑا ہوا۔ تو اس قدر نفیس لباسوں میں ملبوس رہتا۔ کہ دیہاتی لڑکے اُسے "آقا" کہہ کر طعنہ زنی کرتے۔ اور سن رسیدہ لوگ رائیے چرن کو اُس کا دیوانہ کہتے۔

آخر کار اب وہ وقت آیا۔ کہ لڑکا سکول جائے۔ رائیے چرن نے اپنی زمینداری کے حصے کو فروخت کر ڈالا۔ اور کلکتہ چلا گیا۔ وہاں اُسے بڑی دشواری سے بطور غلام ایک جگہ مل گئی اور اُس نے فلینا کو سکول بھیجنا شروع کیا۔ اُس نے اُس کے لئے عمدہ تعلیم نفیس لباس اور بہترین طعام مہیا کرنے میں ہر تکلیف

کو برداشت کیا۔ اس وقت وہ تھوڑے سے چاولوں پر اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ اور اپنے دل سے کہتا تھا " میرے عزیز مرحوم ماسٹر تم مجھ سے اس قدر محبت کرتے تھے۔ کہ میرے گھر آئے۔ اب تم میری طرف سے کوئی لاپروائی نہ دیکھو گے "

اسی طرح بارہ سال گذر گئے۔ لڑکا اچھی طرح لکھنے پڑھنے لگا۔ وہ خوبصورت توانا اور طاقتور تھا۔ رائے چرن اپنی بہت زیادہ توجہ اُس کے صاف رہنے پر رکھتا۔ اور اُس کے بال سنوارنے میں خاص طور سے محنت کرتا تھا۔ وہ اُسے خوب خرچ کرنے دیتا نفیس کپڑے پہناتا۔ اور روپئے کو آزادی کے ساتھ خرچ کرتا۔ لڑکا کبھی بھی رائے چرن کو مثل ایک باپ کے خیال نہ کرتا۔ کیونکہ اُس کے اطوار ایک غلام کی طرح تھے۔ گو اُس کی محبت مثل ایک پدر کے تھی۔ اور رائے چرن نے بھی اس بات کو ہر ایک سے بصیغہ راز رکھا۔ کہ وہ اُس کا باپ ہے۔

رائے چرن کا سن روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اس کا مالک ہمیشہ اُس کے کاموں میں غلطیاں نکالا کرتا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اور بہت جلد ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

اُس کا دماغ بھی بیکار ہو گیا۔ اور وہ رقم جو زمینداری فروخت ہو کر آئی تھی۔ صرف ہو گئی۔ لڑکا برابر اپنے ملبوسات اور اخراجات کے لیئے زیادہ روپیہ مانگتا۔ اور رائے چرن زیادہ خرچ دینے سے مجبور تھا۔

(۳)

رائے چرن اپنی ملازمت سے بیکار ہو گیا۔ اور اُس نے کچھ روپیے فلیپنا کو دے کر کہا ''میں جاتا ہوں۔ کیونکہ مجھے گاؤں میں کچھ ضروری کام ہے۔ اور میں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔ وہ اُسی وقت براسٹ کو جہاں انوکل مجسٹریٹ تھا۔ روانہ ہوا۔ اُس آرام جان غم واندوہ کی وجہ سے بہت کمزور ہو چکی تھی۔ اُس کے پھر کوئی دوسری اولاد نہ ہوئی تھی۔ انوکل تمام دن محنت شاقہ کر کے تھک چکا تھا۔ اور خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری طرف اُس کی بیوی ایک جوگی سے دوبارہ اولاد ہونے کے لیئے کچھ جنتر وغیرہ خرید رہی تھی۔ کہ اتنے میں رائے چرن مکان میں داخل ہوا۔ انوکل کا دل اپنے دیرینہ ملازم کو دیکھ کر نرم ہو گیا۔ اُس نے اُس سے بہت سے سوالات کیئے۔ اور اپنی ملازمت میں دوبارہ لینے کا یقین دلایا۔ رائے چرن خفیف

سا مسکرا دیا۔ اور کہنے لگا۔ "میں اپنی مالکہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"
انوکل معہ رائے چرن کے اس طرف گیا۔ جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی پرانی مالکہ نے اُس کا اس سرگرمی سے استقبال نہ کیا۔ جس قدر اُس کے شوہر نے کیا تھا۔
رائے چرن نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بہت غمگین آواز میں کہا:۔
وہ ۔ ۔ ۔ وہ پرماتما تھی۔ جس نے تمہارے لڑکے کو چرایا۔ وہ میں تھا۔"
انوکل نے متعجب ہو کر کہا۔ "خدایا! آہ! کیا! وہ کہاں ہے؟"
رائے چرن نے جواب دیا۔ وہ میرے پاس ہے۔ میں اُسے پرسوں اپنے ہمراہ لاؤں گا۔"
آج یکشنبہ کا دن تھا۔ کچہری بند تھی۔ دونوں زن و شوہر صبح سے سڑک کی طرف نگاہیں دوڑائے ہوئے تھے۔ دس بجے کے قریب وہ فلینا کو لئے ہوئے آیا۔
انوکل کی بیوی نے بغیر کسی استفسار کے بچّہ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور فرطِ سرور سے از خود رفتہ ہو گئی۔ وہ کبھی متبسم ہوتی۔ کبھی روتی۔ کبھی اُس کو پیار کرتی۔ اس کے بالوں کو بوسہ دیتی اور اُس کو ایک عجیب انداز سے تکتی۔ لڑکا بہت حسین تھا اور

نفیس کپڑوں میں مثل ایک بڑے آدمی کے لڑکے کے ملبوس تھا
انوکُل کا دل محبت پدری کی وجہ سے دھڑک رہا تھا۔ آخر کار اُس
نے دریافت کیا۔ " کیا تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے؟"
رائے چرن نے جواب دیا۔ کہ اس نوع کے کام کا کس طرح کوئی
ثبوت ہو سکتا ہے۔ صرف خدا جانتا ہے۔ کہ مَیں نے ہی تمہارے
لڑکے کو گم کر لیا تھا"
جب انوکُل نے دیکھا۔ کہ اُس کی بیوی اس نعمت کے مل
جانے سے کس قدر مسرور ہے۔ تو اُس نے کسی زیادہ ثبوت پانے
کی سعی نہ کی۔ کیونکہ رائے چرن سا سن رسیدہ آدمی کہاں سے
ایسا لڑکا لا سکتا تھا؟۔ اور کیوں۔ اُس کا باوفا غلام بلا وجہ
اُسے ایسا فریب دیتا؟۔
" مگر" اُس نے خشم آلود ہو کر کہا " رائے چرن تم یہاں
قیام نہیں کر سکتے"
" مَیں کہاں جاؤں" رائے چرن ہاتھ جوڑ کر بولا۔ مَیں اب
بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کون مجھے اب نوکر رکھے گا؟"
مالکہ نے کہا " اسے یہیں رہنے دو۔ مَیں اسے معاف
کرتی ہوں"

"نہیں" اَنو کُل نے جواب دیا۔ اِس نے ایسا جُرم کیا ہے جس کی معافی نہیں ہو سکتی۔"

رائے چرن جُھکا۔ اور مجسٹریٹ کے قدموں کو پکڑ کر کہنے لگا۔ "ماسٹر" مجھے یہیں رہنے دیجئے۔ وہ مَیں نہ تھا۔ جس نے یہ سب کیا۔ وہ خدا تھا۔ اَنو کُل اور بھی غصے ہو گیا۔ جب اُس نے یہ تمام الزامات خدا پر رکھے۔ "نہیں۔" اُس نے کہا۔ "مَیں اُسے برداشت نہیں کر سکتا۔ مَیں تم پر اطمینان نہیں کرتا۔ تُم نے مجھ سے فریب دہی کی ہے۔ رائے چرن کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔ "مَیں نہ تھا جس نے یہ کیا۔"

"پھر وہ کون تھا؟" مجسٹریٹ صاحب نے دریافت کیا۔ "میری قسمت تھی۔" رائے چرن نے جواب دیا۔ مگر اس کو کوئی تعلیم یافتہ شخص تسلیم نہ کر سکتا تھا۔ اَنو کُل اپنی رائے پر غیر متزلزل رہا۔

جب فلینا نے دیکھا۔ کہ وہ ایک مجسٹریٹ کا لڑکا ہے۔ نہ کہ رائے چرن کا تو اُس کو بھی غصہ آنے لگا۔ مگر رائے چرن کی حیرانی دیکھ کر اُس نے اپنے باپ سے کہا۔ "انہیں معاف فرمائیے۔ اگر آپ انہیں اپنے ہمراہ نہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ تو کم از کم ان کی ماہانہ پنشن مقرر فرما دیجئے۔"

اتنا سُن کر رائے چرن ایک لفظ نہ بولا۔ اُس نے اپنے لڑکے کے چہرے پر ایک الوداعی نظر ڈالی۔ اپنے مالک و مالکہ کو سلام کیا۔ اور چلا گیا۔

آخر ماہ میں انوکل نے اُس کے گاؤں میں کچھ روپے روانہ کئے۔ مگر وہ واپس آئے۔ وہاں رائے چرن کے نام کا کوئی آدمی نہ تھا۔

یعنی بد قسمت رائے چرن اپنے گناہ کی تلافی کرنے کے بعد اس جہان سے رُخصت ہو چُکا تھا۔